اشاعت کا ۹۵ واں سال
زبان وادب، تہذیب وثقافت کا ترجمان

نیا دور

فروری ۲۰۱۸ء
۱۰ روپے

وسیم بریلوی
شاعر فتح پوری
رضیہ حامد
اقبال معود
ضیاء فاروقی
احمد محفوظ
راحت بدر
مست حفیظ رحمانی
ریشماں پروین
نور فاطمہ

سلام بن رزاق
عتیق اللہ
شکیل اعظمی
حسن کاظمی
مالتی جوشی
مظہر احمد
شاہ نواز قریشی
زیبا محمود
عائشہ ضیاء

محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

اردو کے مایۂ ناز ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ پیدائش (فروری)

رضا نقوی واہی

شوکت تھانوی

علی عباس حسینی

مخدوم محی الدین

جاں نثار اختر

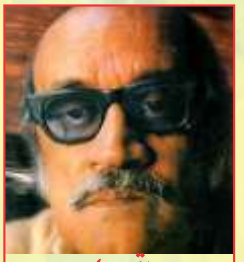
باقر مہدی

فیض احمد فیض

غلام ربانی تاباں

عبدالسلام ندوی

آرزو لکھنوی

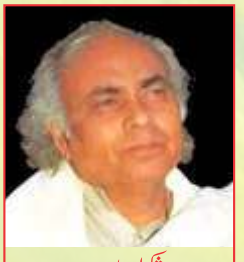
شکیل الرحمان

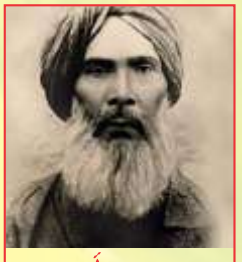
امیر مینائی

واثق جونپوری

اسعد بدایونی

حبیب جالب

رضا نقوی واہی	یکم فروری ۱۹۱۵	۵ر جنوری ۲۰۰۲
شوکت تھانوی	۲ر فروری ۱۹۰۴	۴ر مئی ۱۹۶۳
لطف الرحمان	۲ر فروری ۱۹۴۱	یکم ستمبر ۲۰۱۳
علی عباس حسینی	۳ر فروری ۱۸۹۷	۲۷ر ستمبر ۱۹۶۹
کاوش بدری	۳ر فروری ۱۹۲۸	۲۸ر مئی ۲۰۰۹
مخدوم محی الدین	۴ر فروری ۱۹۰۸	۳۰ر اگست ۱۹۶۹
ظ۔ انصاری	۴ر فروری ۱۹۲۵	۳۱ر جنوری ۱۹۹۱
عنوان چشتی	۵ر فروری ۱۹۳۷	یکم فروری ۲۰۰۴
جاں نثار اختر	۸ر فروری ۱۹۱۴	۸ر اگست ۱۹۷۶
شفیع الدین نیر	۹ر فروری ۱۹۰۳	۳ر جنوری ۱۹۷۸
ضیا فتح آبادی	۹ر فروری ۱۹۱۳	۱۹ر اگست ۱۹۸۴

صلاح الدین پرویز	۹ر فروری ۱۹۵۲	۲۷ر اکتوبر ۲۰۱۱
باقر مہدی	۱۱ر فروری ۱۹۲۷	۲۵ر ستمبر ۲۰۰۶
فیض احمد فیض	۱۳ر فروری ۱۹۱۱	۲۰ر نومبر ۱۹۸۴
وحید قریشی	۱۴ر فروری ۱۹۲۵	۱۷ر اکتوبر ۲۰۰۹
سر راس مسعود	۱۵ر فروری ۱۸۸۹	۳۰ر جولائی ۱۹۳۷
غلام ربانی تاباں	۱۵ر فروری ۱۹۱۴	۷ر فروری ۱۹۹۳
رضیہ سجاد ظہیر	۱۵ر فروری ۱۹۲۸	۱۸ر ستمبر ۱۹۷۹
عبدالسلام ندوی	۱۶ر فروری ۱۸۸۳	۴ر اکتوبر ۱۹۵۶
آرزو لکھنوی	۱۷ر فروری ۱۸۷۳	۱۶ر اپریل ۱۹۵۱
اعجاز صدیقی	۱۷ر فروری ۱۹۱۱	۹ر فروری ۱۹۷۸
کمال احمد صدیقی	۱۷ر فروری ۱۹۲۶	۲۳ر دسمبر ۲۰۱۳

منصور عمر	۱۷ر فروری ۱۹۵۵	۲۳ر اپریل ۲۰۱۴
شکیل الرحمان	۱۸ر فروری ۱۹۳۱	۹ر مئی ۲۰۱۶
مونس رضا	۲۰ر فروری ۱۹۲۵	۱۸ر جولائی ۱۹۹۴
امیر مینائی	۲۱ر فروری ۱۸۲۹	۳۱ر اکتوبر ۱۹۰۰
منشی محبوب عالم	۲۱ر فروری ۱۸۶۲	۲۳ر مئی ۱۹۳۷
واثق جونپوری	۲۳ر فروری ۱۹۰۹	۲۱ر نومبر ۱۹۹۸
اسعد بدایونی	۲۴ر فروری ۱۹۵۸	۵ر مارچ ۲۰۰۳
محمد دین تاثیر	۲۸ر فروری ۱۹۰۲	۳۰ر نومبر ۱۹۵۸
غیاث احمد گدی	۲۸ر فروری ۱۹۲۸	۲۵ر جنوری ۱۹۸۷
حبیب جالب	۲۸ر فروری ۱۹۲۸	۱۲ر مارچ ۱۹۹۳

بشکریہ 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'

جلد : ۷۲ شمارہ : ۱۱

ماہنامہ نیا دور لکھنؤ

فروری ۲۰۱۸ء

پبلشر: انج کمار جھا

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات ورابطہ عامہ، اتر پردیش

ایڈیٹر

سہیل وحید

فون: 9415007694

Ph. No. 2239132 Ext. 228

Email: nayadaurmonthly@gmail.com

معاون

شاہد کمال

رابطہ برائے سرکولیشن وزرِ سالانہ

صبا عرفی

فون: 7705800953

تزئین کار : وقار حسین

کور: ایس.آر.جائسوال

مطبوعہ: پرکاش پیکیجرس، گولہ گنج لکھنؤ

شائع کردہ: محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ، اتر پردیش

زرِ سالانہ : ۱۱۰ روپئے

ترسیل زر کا پتہ

ڈائرکٹر

انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Please send Cheque/Bank Draft in favour of Directer, Information & Public Relations Department, UP, Lucknow

خط وکتابت کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعہ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

۶ پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

اس شمارے میں...

وسیم بریلوی

کہاں کی شمعیں ہیں کن محفلوں میں جلتی ہیں
صفحہ ۲۵

سلام بن رزاق

ندا فاضلی کی دیگر معروف نثری تصانیف
صفحہ ۳۷

شاعر فتح پوری

بشیر بدر کچھ یادیں کچھ باتیں
صفحہ ۶۸

عتیق اللہ

ندا فاضلی کی زندگی کی پیچیدہ نفسیاتی گرہیں
صفحہ ۴۰

رضیہ حامد

بشیر بدر کی شاعری کا انفرادی زاویۂ نگاہ
ص ۷۰

ضیاء فاروقی

بشیر بدر علو ہمت و گہرافشاں
ص ۷۳

اقبال مسعود

بشیر بدر کی تخلیقیت اور سکونت کا امتزاج
ص ۷۵

مظہر احمد

ندا فاضلی کی نثر نگاری قرأت کا ایک خوشگوار تجزیہ
صفحہ ۴۸

احمد محفوظ

بشیر بدر کی شاعری کا نشیب و فراز
صفحہ ۷۸

شاہ نواز قریشی

ندا فاضلی، نئی زمین تلاشنے میں کامیاب
صفحہ ۵۲

حسن کاظمی

اپنے عہد کا ایک درویش صفت اور قلندر
صفحہ ۵۴

مالتی جوشی

کچھ تم بھی بدل کر دیکھو کچھ ہم بھی بدل کر دیکھیں
صفحہ ۹

راحت بدر

بشیر بدر جہاں بھی ہوتے کمال ہی کر رہے ہوتے
صفحہ ۱۴

شکیل اعظمی

ندا فاضلی اپنی منفرد شاعری کے تناظر میں
صفحہ ۴۴

مست حفیظ رحمانی

قیام سیتا پور 'اکائی' کی آمد آمد کا تخلیقی محور
صفحہ ۸۱

زیبا محمود

ندا فاضلی کی شعری کائنات تلازمات وتعلیقات
صفحہ ۶۰

ریشماں پروین

میں دکھوں کے پھول چنا کروں
صفحہ ۸۴

نور فاطمہ

بشیر بدر کی شاعری کے کچھ اہم رموز ونکات
صفحہ ۸۸

عائشہ ضیاء

ندا فاضلی کی شاعری کے امتیازی پہلو
صفحہ ۶۳

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مشمولات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

اپنی بات

'نیادور' کے قارئین اب ہر نئے شمارہ کا انتظار کرتے ہیں۔ اردو لکھنے پڑھنے والے، ادب وتہذیب کے دلدادہ فون کرکے پوچھتے ہیں کہ 'نیادور' کا نیا شمارہ کب آرہا ہے۔ قارئین کا یہ تجسس ہمارے حوصلوں کو نئی توانائی بخش رہا ہے۔ ہم نے 'نیادور' کے ہر شمارے کو ایک نئی تھیم پر تیار کرنے کی کوشش کی ہے جس میں ابھی تک ہم کامیاب بھی رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ کامیابی ادباء اور شعراء کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں۔ ہم ان سب کے شکرگزار ہیں جو 'نیادور' میں ہماری ایماء پر اپنی تخلیقات سے نوازتے ہیں اور ساتھ میں اپنے مشوروں سے بھی۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ بھی 'نیادور' کا ہر شمارہ ایک خاص شمارہ کے طور پر پیش کریں گے۔

چونکہ 'نیادور' کا ہر شمارہ ایک تھیم کی مناسبت سے کسی نہ کسی موضوع پر مرکوز ہوتا ہے اس لئے ہم ان تمام ریسرچ اسکالرس اور یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں سے تعلق رکھنے والے اساتذہ کے ایسے مضامین شائع کرنے سے قاصر ہیں جو وہ وقتاً فوقتاً اپنی مرضی اور اپنی تحقیقی ضروریات کے تحت لکھتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے مضامین کی اشاعت ان سب کی پروفیشنل ضرورت ہے لیکن ہم ایسے مختلف النوع مضامین کو اکٹھا کرکے شائع کردینے میں یقین ہی نہیں رکھتے ہیں کہ کھچڑی نما ادبی مواد ہر ماہ ایک خوبصورت کور میں لپیٹ کر پیش کردیا جائے۔ ہمارا ادبی ایقان ہے کہ کسی بھی جریدہ یا رسالہ کے ہر شمارہ کی ایک مخصوص جہت ہوتا کہ قاری کی علمی اور ادبی تشنگی کو کسی حد تک دور کیا جاسکے۔ یہ کام آسان نہیں ہے، اس کے لئے بڑی مشقت اور وژن کی ضرورت ہے۔ اس طرح ہر شمارے کو ایک نیا آہنگ دینے میں بڑی مشکلیں آرہی ہیں۔ لیکن ہم اپنی اس روش پر قائم رہنے کی آخر تک کوشش کریں گے باوجودیکہ طرح طرح کی چہ می گوئیاں ہورہی ہیں کہ 'نیادور' میں ان لوگوں کی تخلیقات اب شائع نہیں ہورہی ہیں جو کبھی بھی کچھ بھی لکھ کر بھیج دیا کرتے تھے۔ ہماری کوشش 'نیادور' کو تکنیک کے جدید پیرائے پر منحصر اردو سے آراستہ کراس کے قارئین کی تعداد لاکھوں تک پہنچانا ہے۔ 'نیادور' کی رسائی حالانکہ تمام سرحدوں کو عبور کرچکی ہے پھر بھی ہماری کوشش ہے کہ دنیا کے ہر اس خطے میں جہاں جہاں اردو بولی، پڑھی اور لکھی جاتی ہے، وہاں وہاں 'نیادور' اپنی موجودگی درج کرائے۔

اردو سے متعلق ایک اور بات۔ رجسٹرار آف نیوز پیپرس آف انڈیا کی سالانہ رپورٹ شائع ہوگئی ہے۔ سال ۱۶-۲۰۱۵ء کی رپورٹ ہندوستان میں اردو اخبارات کی تعداد میں روز بہ روز ہورہے اضافہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق ہندی اور انگریزی کے بعد اردو کے اخبارات و رسائل کی تعداد سب سے زیادہ ہے یعنی ہندوستان کی دیگر قومی زبانوں میں اردو سرفہرست ہے اور ہندی اور انگریزی کے بعد اس کا نمبر تیسرا ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق مندرجہ بالا مدت میں اردو کے پانچ ہزار چار سو تیئس نئے اخبارات رجسٹرار کے دفتر میں رجسٹرڈ ہیں اور ان کی باقاعدہ اشاعت جاری ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اعداد وشمار میں اردو کے ادبی رسائل بھی شامل ہیں۔ یہ خبر ان لوگوں کے لئے بڑی مایوس کن ہے جو ہمیشہ اردو کی تنزلی کا ماتم کرتے رہتے ہیں کہ اردو ختم ہورہی ہے یا موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا ہے لیکن محبان اردو کے لئے یہ رپورٹ نہ صرف اطمینان بخش ہے بلکہ مسرت کی باعث بھی ہے۔

فروری ۲۰۱۸ء کا یہ شمارہ عہد حاضر کے دو بیحد مقبول اور منفرد شاعروں کے نام معنون ہے۔ بشیر بدر عصری اردو شاعری کا وہ مقبول ترین نام ہے جس کی شہرت نے دنیا کی کسی بھی حدود کی پروا نہیں کی۔ بشیر بدر کی شاعری نہ صرف منفرد ہے بلکہ بیباکی کے نئے معیار گڑھتی ہے۔ انہوں نے شاعری میں جتنے تجربے کئے، وہ شاید کسی اور کا خاصہ نہیں۔ ان کے متعدد اشعار ضرب المثل کا درجہ حاصل کرچکے ہیں۔ بشیر بدر ہمارے دور کا وہ محبوب نام ہے جس سے شاید ہی کسی کو احتراز ہو۔ نئے مزاج، نئے انداز واطوار، نئے پیرائے اور زاویئے۔ ان کی شاعری کی تعریف کیلئے الفاظ کم پڑنے لگتے ہیں۔ ہم اس شمارے میں بشیر بدر کی ۱۵ فروری کو ۸۳ ویں یوم ولادت کے مبارکباد کے طور پر ان کے ہم عصروں کے تاثرات وخیالات کے علاوہ ان کی زندگی کے کچھ ناشنیدہ پہلوؤں پر مختصر مضامین بھی شائع کررہے ہیں۔

ندا فاضلی بھی ہمارے دور کے منفرد اور بیحد خلاق ذہن شاعر اور ادیب تھے۔ ۸ فروری ۲۰۱۶ء کو اس جہان فانی سے کوچ کرگئے۔ انہوں نے شاعری ہی نہیں کی بلکہ شعری پیرائے میں بہت ہی خوبصورت نثر بھی تخلیق کی۔ ان کے بھی کئی اشعار ضرب المثل کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی کچھ نظمیں لافانی ہیں مثلاً انہوں نے اپنے والد کی موت پر جو نظم لکھی ہے، اس کی مثال پورے اردو کیا عالمی ادب میں بھی شاید ہی ملے۔ 'یہ زندگی' ان کی دوسری بہترین نظم ہے۔ ان کی درجنوں ایسی نظمیں ہیں جس پر لوگ ابھی بھی سر دھنتے ہیں۔ جگجیت سنگھ نے ان کی نظموں اور غزلوں کو جو نغمگی اور موسیقیت بخشی اس کی داد نہ دی جائے تو بھی ناانصافی ہوگی۔ انہوں نے کئی ٹی وی سیریل اور فلموں کے نغمے اور اسکرپٹ بھی لکھیں۔

ہم اپنے عہد کے ان دونوں باکمال شاعروں پر جو بھی مواد 'نیادور' کے اس شمارے میں شائع کررہے ہیں، اس سے ان دونوں شخصیتوں کی بھرپور عکاسی ممکن نہیں لیکن پھر بھی ہم نے ایک کوشش کی ہے۔ ہم کتنا کامیاب ہیں، یہ ہمارے قارئین بتائیں گے۔ ان دونوں شاعروں پر ایک شمارہ شائع کرنے کا خیال یوں آیا کہ ہمیں اکثر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت جو لوگ زندگی کی چالیس پچاس بہاریں دیکھ چکے ہیں، ان کا بچپن ساحر لدھیانوی اور شکیل بدایونی کی شاعری پڑھتے ہوئے گزرا۔ جوانی پروین شاکر، مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی، ندا فاضلی اور بشیر بدر کے اشعار گنگناتے ہوئے کٹی لیکن ان کے بڑھاپے کا کوئی شاعر نہیں ہے۔ دور دور تک اندھیرا ہے۔

یہ شمارہ ندا فاضلی اور بشیر بدر کی نذر کرتے ہوئے ہمیں بے پناہ مسرت ہورہی ہے۔ 'نیادور' کے اصرار پر خاص طور سے وسیم بریلوی، سلام بن رزاق، مالتی جوشی، راحت بدر، رضیہ حامد، عتیق اللہ، احمد محفوظ اور شاعر فتح پوری وغیرہ کے قلمی تعاون کے لئے ہم شکرگزار ہیں۔

اس خصوصی شمارہ کے مشمولات کی بنا پر 'نیادور' کے مستقل کالم بازدید، ہندی کہانی، گزشتہ لکھنؤ، غیر ملکی ادب، گل افشانیاں وغیرہ ملتوی کئے جارہے ہیں۔

۲۰۱۸ء کی ابتداء میں ہی جدید شاعری کے اہم ستون محمد علوی کا انتقال ہوگیا۔ جدید شاعری کا نیا مزاج پیدا کرنے کا سہرا محمد علوی کے سر ہی جاتا ہے۔ اردو ادب کا ایک اور بے پناہ مقبول ادیب وشاعر ساقی فاروقی بھی ہم سے جدا ہوگیا۔ اس کے علاوہ بہترین ناظم مشاعرہ انور جلالپوری کے ساتھ ساتھ سکندر حیات خاں، قدیر زماں، رسا چغتائی نے ۲۰۱۸ء کی ابتداء ہی میں ہمیں الوداع کہا۔ ادارہ 'نیادور' اردو ادب کے ان ادیبوں اور شاعروں کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

نیادور فیس بک اور واٹس اپ پر بھی

نیا دور کے شمارے مئی تا حال فیس بک اور واٹس اپ پر قارئین کے مطالعہ لئے پوسٹ کردئے گئے ہیں اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

نیادور ریختہ پر

'نیادور' کے گزشتہ برس کے شمارے rekhta.org پر اپلوڈ کردئے گئے ہیں۔ عالمی سطح پر اردو کے مختلف حلقوں تک 'نیادور' کی رسائی میں اب کوئی دشواری نہیں رہ گئی ہے۔

ندا فاضلی

جو اس گھڑی نام ہے تمہارا

یہ زندگی
آج جو تمہارے
بدن کی چھوٹی بڑی نسوں میں ہے
مچل رہی ہے
تمہارے پیروں سے چل رہی ہے
تمہاری آواز میں
گلے سے نکل رہی ہے
تمہارے لفظوں میں ڈھل رہی ہے
یہ زندگی
جانے کتنی صدیوں سے
یونہی شکلیں بدل رہی ہے
بدلتی شکلوں، بدلتے جسموں میں
چلتا پھرتا یہ اک شرارہ
جو اس گھڑی نام ہے تمہارا
اسی سے ساری چہل پہل ہے
اسی سے روشن ہے ہر نظارہ
ستارے توڑو، یا گھر بساؤ
علم اٹھاؤ یا سر جھکاؤ
تمہاری آنکھوں کی روشنی تک ہے کھیل سارا
یہ کھیل
ہوگا نہیں دوبارہ

شناخت کی دعا

دعائیں مانگو
دعائیں مانگو
شجر حجر میں
ہر اک ثمر میں
کسی کا مسکن رہے ہمیشہ
وہ نام جس کے حروف سارے
زمین آکاش پھول تارے
وہ نام روشن رہے ہمیشہ
قدیم قبروں پہ سر جھکائے
گھنیرے پیڑوں کی ڈالیوں پر
شفیق ماؤں سی فاختائیں
تلاوتوں کے دیئے جلائیں
اندھیرا درپن بشارتوں کا
اجالا جیسے فرشتہ کوئی صحیفہ کھولے
وسیع گہرے سمندروں میں
خدا کے پیروں کا عکس ڈولے
دعائیں مانگو
ہمارے اندر
ہمارے ماں باپ کی شبیہیں
ہمارے ہونٹوں سے مسکرائیں
ہماری آنکھوں سے جگمگائیں
ہماری تنہائیاں بسائیں
دعائیں مانگو

انتظار

مدتیں بیت گئیں
تم نہیں آئیں اب تک
روز سورج کے بیاباں میں بھٹکتی ہے حیات
چاند کے غار میں
تھک ہار کے سو جاتی ہے رات
پھول کچھ دیر مہکتا ہے
بکھر جاتا ہے
ہر نشہ
لہر بناتے ہی اتر جاتا ہے
وقت بے چہرہ ہواؤں سا گزر جاتا ہے
کسی آواز کے سبزے میں لہک جیسی تم
کسی خاموش تبسم میں چمک جیسی تم
کسی چہرے پہ مہکتی ہوئی آنکھوں جیسی
کہیں ماتھا، کہیں گیسو، کہیں بانہوں جیسی
چاند سے پھول تلک
یوں تمہیں تم ہو مگر
تم کوئی چہرہ، کوئی جسم، کوئی نام نہیں
تم جہاں بھی ہو
ادھوری ہو حقیقت کی طرح
تم کوئی خواب نہیں ہو
جو مکمل ہوگی

والد کی وفات پر

تمہاری قبر پر
میں فاتحہ پڑھنے نہیں آیا
مجھے معلوم تھا
تم مر نہیں سکتے
تمہاری موت کی سچی خبر جس نے اڑائی تھی
وہ جھوٹا تھا
وہ تم کب تھے
کوئی سوکھا ہوا پتہ ہوا سے مل کے ٹوٹا تھا
مری آنکھیں
تمہارے منظروں میں قید ہیں اب تک
میں جو بھی دیکھتا ہوں
سوچتا ہوں
وہ وہی ہے
جو تمہاری نیک نامی اور بدنامی کی دنیا تھی
کہیں کچھ بھی نہیں بدلا
تمہارے ہاتھ میری انگلیوں میں سانس لیتے ہیں
میں لکھنے کے لیے
جب بھی قلم کاغذ اٹھاتا ہوں
تمہیں بیٹھا ہوا میں اپنی ہی کرسی میں پاتا ہوں
بدن میں میرے جتنا بھی لہو ہے
وہ تمہاری
لغزشوں ناکامیوں کے ساتھ بہتا ہے
مری آواز میں چھپ کر
تمہارا ذہن رہتا ہے
مری بیماریوں میں تم
مری لاچاریوں میں تم
تمہاری قبر پر جس نے تمہارا نام لکھا ہے
وہ جھوٹا ہے
تمہاری قبر میں میں دفن ہوں
تم مجھ میں زندہ ہو
کبھی فرصت ملے تو فاتحہ پڑھنے چلے آنا

انتقام

مندروں مسجدوں کی دنیا میں
مجھ کو پہنچانتے کہاں ہیں لوگ
روز میں چاند بن کے آتا ہوں
دن میں سورج سا جگمگاتا ہوں
کھنکھناتا ہوں ماں کے گہنوں میں
ہنستا رہتا ہوں چھپ کے بہنوں میں
میں ہی مزدور کے پسینے میں
میں ہی برسات کے مہینے میں
میری تصویر آنکھ کا آنسو
میری تحریر جسم کا جادو
مندروں مسجدوں کی دنیا میں
مجھ کو پہچانتے نہیں جب لوگ
میں زمینوں کو بے ضیا کر کے
آسمانوں میں لوٹ جاتا ہوں
میں خدا بن کے قہر ڈھاتا ہوں

وقت کی خالی آنکھ

چاک کر کے میرے سینے کا کنول
اڑ گئے
پیڑ سمندر آکاش
میری بے نور صداؤں کے اسیر
اب کوئی دیو
نہ پتھر
نہ چراغ
بند کمرہ ہیں نگاہیں میری
اب نہ بادل نہ ہوائیں میری
کھو گئیں چاروں دشائیں میری
بجھ گیا درد کے ماتھے پہ چمکتا تارا
اب نہ مہکار
نہ وستار
نہ قصہ
نہ خمار
وقت کی آنکھ ہے خالی، کوئی میزان
نہیں
اب کسی رنگ کی پہچان نہیں

چھوٹا آدمی

تمہارے لئے سب دعا گو ہیں
تم جو نہ ہوگے
تو کچھ بھی نہ ہوگا
اسی طرح مر مر کے جیتے رہو تم
تمہیں ہر جگہ ہو
تمہیں مسئلہ ہو
تمہیں حوصلہ ہو
مصور کے رنگوں میں
تصویر بھی تم
مصنف کے لفظوں میں
تحریر بھی تم
مقرر کے نعروں میں
تقریر بھی تم
تمہارے لئے ہی
خدا باپ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو
قرباں کیا ہے
سبھی آسمانی کتابوں نے تم پر
تمہارے عذابوں کو آساں کیا ہے
خدا کی بنائی ہوئی اس زمیں پر
جو سچ پوچھو تم سے محبت ہے سب کو
تمہارے دکھوں کا مداوا نہ ہوگا
تمہارے دکھوں کی ضرورت ہے سب کو

ندا فاضلی

نئے سال کی پہلی نظم

وہ جو
پھٹے پرانے جوتے گانٹھ رہا ہے
وہ بھی میں ہوں
وہ جو
گھر گھر دھوپ کی چاندی بانٹ رہا ہے
وہ بھی میں ہوں
وہ جو
اڑتے پروں سے امبر پاٹ رہا ہے
وہ بھی میں ہوں
وہ جو
ہری بھری شاخوں کو کاٹ رہا ہے
وہ بھی میں ہوں
سورج چاند نگاہیں میری
سال مہینے راہیں میری
کل بھی مجھ میں
آج بھی مجھ میں
چاروں اور دشائیں میری
اپنے اپنے آکاروں میں
جو بھی چاہے بھر لے مجھ کو
جس میں جتنا سما سکوں میں
اپنا اپنا کر لے مجھ کو
ہر چہرہ ہے میرا چہرہ
بے چہرہ اک درپن ہوں میں
پل پل روپ بدلنے والی
مٹی ہوں میں
جیون ہوں میں

گیت

تیرے پیروں چلا نہیں جو
دھوپ چھاؤں ڈھلا نہیں جو
وہ تیرا سچ کیسے، جس پر تیرا نام نہیں
تجھ سے پہلے بیت گیا جو
وہ اتہاس ہے تیرا
تجھ کو ہی پورا کرتا ہے
جو بن باس ہے تیرا
تیری سانسیں جیا نہیں جو
گھر آنگن کا دیا نہیں جو
وہ تلسی کی رامائن ہے تیرا رام نہیں
وہ تیرا سچ کیسے
تیرا تن ہی پوجا گھر ہے
کوئی مورت گڑھ لے
کوئی پستک ساتھ نہ دے گی
چاہے جتنا پڑھ لے
تیرے سر میں سجا نہیں جو
اک تارے پر بجا نہیں جو
وہ میرا کی سم پتی ہے تیرا شیام نہیں
وہ تیرا سچ کیسے جس پر تیرا نام نہیں

مرمت کی ضرورت

بہت میلا ہے یہ سورج
کسی دریا کے پانی میں
اسے دھو کر سجائیں پھر
گگن میں چاند بھی
کچھ دھندلا دھندلا ہے
مٹا کے اس کے سارے داغ دھبے
جگمگائیں پھر
ہوائیں سو رہی ہیں
پربتوں پر پاؤں پھیلائے
جگا کے ان کو نیچے لائیں
پیڑوں میں بسائیں پھر
دھماکے کچی نیندوں میں
ڈرا دیتے ہیں بچوں کو
دھماکے بند کر کے
لوریوں کو گنگنائیں پھر
وہ جب سے آئی ہے
یوں لگ رہا ہے
اپنی یہ دنیا
جو صدیوں کی امانت ہے
جو ہم سب کی وراثت ہے
پرانی ہو چکی ہے
اس میں اب تھوڑی
مرمت کی ضرورت ہے

غزل

بیسن کی سوندھی روٹی پر کھٹی چٹنی جیسی ماں
یاد آتی ہے چوکا، باسن، چمٹا، پھکنی جیسی ماں

بان کی کھری کھاٹ کے اوپر ہر آہٹ پر کان دھرے
آدھی سوئی، آدھی جاگی، تھکی دوپہری جیسی ماں

چڑیوں کی چہکار میں گونجے رادھا موہن علی علی
مرغے کی آواز سے بجتی گھر کی کنڈی جیسی ماں

بیوی، بیٹی، بہن، پڑوسن، تھوڑی تھوڑی سی سب میں
دن بھر اک رسی کے اوپر چلتی نٹنی جیسی ماں

بانٹ کے اپنا چہرہ، ماتھا، آنکھیں، جانے کہاں گئی
پھٹے پرانے اک البم میں چنچل لڑکی جیسی ماں

غزل

جو ہو اک بار وہ ہر بار ہو ایسا نہیں ہوتا
ہمیشہ ایک ہی سے پیار ہو ایسا نہیں ہوتا

ہر اک کشتی کا اپنا تجربہ ہوتا ہے دریا میں
سفر میں روز ہی منجدھار ہو ایسا نہیں ہوتا

کہانی میں تو کرداروں کو جو چاہے بنا دیجے
حقیقت بھی کہانی کار ہو ایسا نہیں ہوتا

کہیں تو کوئی ہوگا جس کی اپنی بھی ضرورت ہو
ہر اک بازی میں دل کی ہار ہو ایسا نہیں ہوتا

سکھا دیتی ہیں چلنا ٹھوکریں بھی راہ گیروں کو
کوئی رستہ سدا دشوار ہو ایسا نہیں ہوتا

غزل

آتی جاتی ہر محبت ہے چلو یوں ہی سہی
جب تلک ہے خوبصورت ہے چلو یوں ہی سہی

ہم کہاں کے پارسا ہیں بے وفا وہ ہیں تو کیا
گھر میں کوئی گھر کی زینت ہے چلو یوں ہی سہی

بھول تھی اپنی فرشتہ آدمی میں ڈھونڈنا
آدمی میں آدمیت ہے چلو یوں ہی سہی

میلے ہو جاتے ہیں رشتے بھی لباسوں کی طرح
دوستی ہر دن کی محنت ہے چلو یوں ہی سہی

جیسی ہونی چاہئے تھی ویسی تو دنیا نہیں
دنیاداری بھی ضرورت ہے چلو یوں ہی سہی

غزل

دیکھا ہوا سا کچھ ہے تو سوچا ہوا سا کچھ
ہر وقت میرے ساتھ ہے الجھا ہوا سا کچھ

ہوتا ہے یوں بھی راستہ کھلتا نہیں کہیں
جنگل کا پھیل جاتا ہے کھویا ہوا سا کچھ

ساحل کی گیلی ریت پہ بچوں کے کھیل سا
ہر وقت مجھ میں بستا،بکھرتا ہوا سا کچھ

فرصت نے آج گھر کو سجایا کچھ اس طرح
ہر شئے سے مسکراتا ہے روتا ہوا سا کچھ

دھندلی سی ایک یاد کسی قبر کا دیا
اور میرے آس پاس چمکتا ہوا سا کچھ

کچھ تم بھی بدل کر دیکھو
کچھ ہم بھی بدل کر دیکھیں

مالتی جوشی

ہندی اور گجراتی فلموں کی اداکارہ

تھیٹر کی نمائندہ آرٹسٹ

غزل کی مشہور سنگر

بنیادی طور پر گلوکارہ

وطن راجکوٹ، گجرات،

پرورش ممبئی

201-B، سن رائز بلڈنگ

آرام نگر ۲، وارسووا

اندھیری (مغرب)، ممبئی

رابطہ: 08425933990

سنا ہے دو دلوں کو جب ملانا ہوتا ہے تو پوری کائنات اس میں لگ جاتی ہے۔ ہمارے یعنی میرے اور ندا فاضلی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ مجھے نہیں معلوم یہ سب کیسے ہوا۔ بہت وقت بھی لگا اس میں، لیکن بالآخر ہم مل گئے۔

گرانٹ روڈ پر واقع جیوتی اسٹوڈیو کے امر ملن پروڈکشن میں پروڈیوسر کے آفس میں پہلی بار مالتی اور ندا فاضلی کی ملاقات ہوتی ہے۔

پروڈیوسر نے مالتی کو ہیروئن کے رول کے لئے بلایا ہے۔ وہ مالتی سے کہتے ہیں سنو، یہ سین تمہیں ذہن میں رکھ کر ہی لکھا گیا ہے۔ ندا سے تعارف کراتے ہیں اور سین سنانے کو کہتے ہیں۔

ندا سناتے ہیں.....لڑکا کمرے میں آتا ہے، بیڈ پر رکھے ہوئے کپڑوں کو دیکھتا ہے۔ شرٹ اتار کر دوسرے کپڑے پہننے لگتا ہے۔ کھڑکی سے دو آنکھیں چھپ کر لڑکے کو دیکھ رہی ہیں۔ صرف آنکھیں دکھائی دے رہی ہیں (کیمرہ صرف آنکھیں دکھاتا ہے) اسے اٹھا کر سونگھتی ہے، محسوس کرتی ہے۔ اتنے میں آہٹ سی ہوتی ہے۔ لڑکی بھاگ کر کمرے سے باہر نکل جاتی ہے۔ عمر یہی کوئی ۱۸۔۱۷ سال۔

مالتی کی بڑی بڑی آنکھیں، گورا چہرہ، لمبے کالے گھنے بال، پروڈیوسر نے کہا، مجھے ایسی ہی ہیروئن چاہئے تھی اپنی کہانی کے لئے۔ اس وقت یہ معلوم نہیں تھا کہ ایک کہانی قدرت بھی لکھ رہی ہے۔ اس کے بعد ملاقاتیں ہوتی رہیں، کہانی کی سیٹنگ میں مالتی کے گھر پر۔

میوزک ڈائرکٹر مانس مکرجی (مشہور پلے بیک سنگر شان کے والد) ٹیون بناتے، ندا گیت لکھتے، پروڈیوسر کہتے تھے کہانی ہیروئن پر ہے۔ اسی لئے اسے دیکھ کر لکھو گے تو اچھا لکھ سکو گے۔ اس وقت ہم ورلی میں یونم اپارٹمنٹ میں رہتے تھے۔ کچھ دن یہ سلسلہ چلا لیکن اس دوران میری اور ندا کی بات چیت نہیں ہوتی تھی۔ میں بھی کم بولتی تھی اور ندا بھی زیادہ بات نہیں کرتے تھے۔ پہچان تو ہوئی لیکن جان پہچان نہیں ہوئی۔ دھیرے دھیرے کام میں پروگریس ہوئی تو ہم (میرا پریوار) ورلی سے باندرہ کارٹر روڈ شفٹ ہو گئے۔ یہ بھی ایک طرح کا اتفاق ہی تھا۔

ورلی میں ندا جی ہمارے اوپر کے فلیٹ میں کسی کو ٹیوشن پڑھانے آتے تھے۔ آتے جاتے کھڑکی سے

کبھی کبھی دکھائی دیتے تھے۔ جب ہم ورلی چھوڑ کر باندرہ شفٹ ہو گئے تو ندا جی سے ملاقات یا جو تھوڑی بہت جھلک دکھائی دیتی تھی وہ بھی بند ہوگئی۔ ایسا لگتا جیسے کہانی ختم ہوگئی لیکن ختم نہیں ہوئی تھی، تھوڑا رُک گئی تھی۔ انہوں نے بھی اپنی زندگی کا پہلا مکان خریدا اور وہ بھی اسی ایریا میں جہاں میرا گھر تھا۔ میرے گھر سے دس منٹ کے فاصلے پر ان کا گھر تھا لیکن مجھے معلوم نہیں تھا۔

فلموں میں کام کرنے کے دوران میرا چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا، ڈاکٹر نے مجھے کچھ وقت کے لئے بریک لینے کو کہا۔ ان دنوں گانا میں صرف شوقیا گاتی تھی اور سیکھنے پر زیادہ دھیان دیتی تھی۔ جب سارا کام بند کرنا پڑا تو میں نے آرام سے کرنے والا کام (بھجن گانا) شروع کیا۔ ان دنوں سارے سنگر غزل گا رہے تھے۔ میں نے بھی گانا شروع کیا۔ مالک کی مہربانی سے گانا بہت ہٹ ہو گیا۔

ادھر ندا جی بھی شاعر کے طور پر مشہور ہونے لگے تھے۔ جگجیت سنگھ کی انٹری ہو گئی تھی۔ اور دنیا جسے کہتے ہیں، غزل بہت ہٹ ہو گئی تھی۔ میں اس غزل کے شاعر کی فین ہو گئی تھی۔ میرا گانا ہٹ ہونے سے بہت سے پروگرام چلنے لگے۔ لوگ البم بنانے کے لئے آنے لگے۔ ریکارڈنگ کے لئے شاعری کی ضرورت تھی۔ میرے دماغ میں شاعر ندا فاضلی چھائے ہوئے تھے، لیکن انہیں تلاش کہاں کروں، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ کیا میں انہیں جانتی بھی ہوں یا نہیں؟

اسی الجھن کے دوران ایک دن جیسے چمتکار ہو گیا۔ میری چھوٹی بہن بینک گئی تھی جو دانڈا کھار کے پاس واقع بینک آف انڈیا تھا، ندا جی کے گھر کے سامنے، ان کا بھی اکاؤنٹ وہیں تھا۔ اس دن جب میری بہن وہاں گئی تھی تو ندا جی بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔ میری چھوٹی بہن کو وہاں دیکھ کر ندا جی خوش ہو گئے۔ بہن کا نام کمل تھا (جو اب اس دنیا میں نہیں ہے) کہنے لگے، تم یہاں کیا کر رہی ہو اور گھر میں سب کیسے ہیں؟ کمل نے بتایا ہم نے یہاں نیا گھر لیا ہے۔ انہوں نے اپنے گھر کا پتہ بتایا جو سامنے ہی تھا اور کمل نے ہمارے گھر کا پتہ اور فون نمبر دیا اور فون کرنے کو کہا۔ انہوں نے خاص طور سے پوچھا، مالتی جی کیسی ہیں؟ میرا نمستے کہنا۔ پتہ چلا دوسرے ہی دن صبح صبح چائے پینے آگئے، ہم سب بہت خوش ہوئے۔

اس کے بعد بہت سی باتیں ہوئیں۔ فلموں کی، گانوں کی، بات بات میں پتہ چلا کہ دنیا جسے کہتے ہیں، وہ غزل ان کی ہے۔ میری تو خوشی کا جیسے ٹھکانا ہی نہیں رہا۔ میں انہیں ڈھونڈھ رہی تھی اور وہ میرے سامنے تھے، ایسا لگا جیسے بھگوان مل گئے ہوں۔ ان کے گھر کا پتہ اور فون نمبر جلدی سے لے لیا اور دوسرے ہی دن فون کر کے ان کے گھر پہنچ گئی۔ بہانہ تھا غزلیں چاہئے۔ غزل کی وجہ سے ہم دھیرے دھیرے دوست بنتے گئے۔ ہفتے میں دو تین دن وہ میرے گھر آتے تھے۔ کبھی کبھی میں ان کے وہاں جاتی تھی۔ ہم ساتھ بیٹھ کر کمپوزیشن بناتے تھے۔ انہوں نے مجھے بہت کچھ سکھایا، ادب کے بارے میں، اردو کے بارے میں، کمپوزیشن کے بارے میں۔ میری دلچسپی غزل میں تھی لیکن میرا بیک گراؤنڈ ویسا بالکل نہیں تھا۔ میں ٹپکل گجراتی دیہی (پنڈت) کے پریوار سے تھی۔ اس لئے ان سب چیزوں سے بالکل ناآشنا تھی۔ انہوں نے میرا حوصلہ بڑھایا اور مجھے سپورٹ کیا۔

'ہوش والوں کو خبر کیا...' ایک شام ندا فاضلی کے نام کے عنوان سے پونہ میں غزل سرا مالتی جوشی

فلموں کا سفر بھی اچھا رہا۔ جس فلم میں ہم ملے تھے اس کا نام تھا 'گل مہر' اسکرین پلے، ڈائیلاگ، گانے بائی ندا فاضلی۔ لیکن وہ فلم بنی ہی نہیں۔ اس کے بعد میں نے سب سے پہلے ایک ہریانوی فلم کی (چودھری ہرفل سنگھ) اس کے بعد مہاستی مینا سندری کی، جس میں مینا سندری کا ٹائٹل رول کیا۔ پھر چمبل کے ڈاکو، گروسلیمان، چیلا پہلوان (دارا سنگھ) محمود کے ساتھ کی۔ اس میں ان کی بہن کا رول کیا۔ اس کے علاوہ گجراتی آشا پُراما تانی چندری جو دوزبانوں میں بنی اور آج کل یوٹیوب پر بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے بعد سہانا سفر اور میرے ہمسفر شرمیلا ٹیگور کے ساتھ تھی، ایسی بہت سی فلمیں۔

پہلے، ہفتے میں ملتے تھے پھر دھیرے دھیرے روز ملنے لگے۔ آہستہ آہستہ میں ان کی ضرورت بن

گئی۔ وہ باہر مشاعرے میں جاتے تو مجھے گھر کی چابی دے کے جاتے اور گھر کا خیال رکھنے کو کہہ کے جاتے۔

کچھ وقت ایسے ہی گزرا، ہم بہت قریب آ گئے۔ ۱۹۸۷ء میں میری ماں کا انتقال ہو گیا۔ میں ماں کے ساتھ بہت اٹیچ تھی۔ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن ان کے جانے سے میں بہت ٹوٹ گئی۔ ماں کا گزر جانا میرے لئے ٹرننگ پوائنٹ تھا۔ ان کے جانے سے زندگی میں ایک خالی پن سا آ گیا تھا۔ ندا جی نے اس وقت مجھے بہت سنبھالا۔ انہوں نے کہا، مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ انہوں نے ایک غزل لکھی:

ممکن ہے سفر ہو آساں
اب ساتھ بھی چل کر دیکھیں
کچھ تم بھی بدل کر دیکھو
کچھ ہم بھی بدل کر دیکھیں

اس طرح انہوں نے پرپوز کیا۔ حالانکہ ان کے گھر کے لوگ اس رشتے سے ناخوش تھے۔ میرے گھر کے لوگ ندا جی کو بہت پسند کرتے تھے۔ شادی کی بات چلی لیکن آگے نہیں بڑھی۔

۱۹۸۸ء میں مجھے غزل کے پروگرام کے لئے بحرین جانا پڑا، کافی دنوں تک وہیں رہنا پڑا، وہاں ان کے خط آتے رہتے تھے۔ ایک دن وہ خود دبئی تک آ گئے کافی دنوں تک وہیں رہنا پڑا او رکہا ملنے کے لئے آ جاؤ لیکن میرے پاس دبئی کا ویزا نہیں تھا اور وہاں سے لگ بھی نہیں سکتا تھا، وہ بھی نہیں آ سکتے تھے۔ دبئی اور بحرین کے درمیان ایک پل تھا لیکن ملنا مشکل تھا۔ وہ مایوس واپس لوٹ گئے۔ پھر بہت زور دیا کہ لوٹ آؤ تو میں پروگرام چھوڑ کر درمیان میں ہی انڈیا واپس آ گئی۔

۲۰۱۳ء میں صدر جمہوریۂ ہند نے ندا فاضلی کو پدم شری ایوارڈ سے نوازا

پٹنہ کے ایک مشاعرے کا منظر جس میں مشہور شعراء کے ساتھ وزیر اعلیٰ نتیش کمار بھی موجود تھے۔ ندا فاضلی (دائیں)

بحرین سے واپس آنے کے بعد میں پروگرام کے لئے کناڈا چلی گئی۔ چندن داس (غزل سنگر) کے ساتھ کچھ مہینے وہاں رکنے کے بعد پھر کچھ ٹائم کے بعد چار پانچ مہینے کے لئے کینیا چلی گئی۔ وہی پروگرام کے سلسلہ میں۔ اس طرح بار بار میرے باہر جانے کی وجہ سے وہ کافی ڈسٹرب ہو جاتے تھے۔ پھر انہوں نے سوچا کہ جب تک کسی بندھن میں نہیں باندھیں گے یہ پنچھی کی طرح اڑتی رہے گی۔

ایک بار ایک خط میں انہوں نے مجھے پنچھی ہی کہا تھا، لکھا تھا، تم آزاد اڑنے والا پنچھی ہو اس لئے تمہیں یہاں بندھ کے رہنا اچھا نہیں لگتا۔ خیر، اس کے بعد میں نے بھی سوچا کہ انتظار کی انتہا نہیں ہونی چاہئے اور پھر شادی کی بات چھیڑی۔ وہ مان گئے اور ۱۹۹۲ء میں ہم نے شادی کر لی۔ اس کے بعد میں نے اس طرح باہر جانا کم کر دیا، جاتے تھے تو دونوں ساتھ ساتھ۔

ان کا نیچر بہت اچھا تھا، بہت سیدھا تھا، بچوں جیسا معصوم۔ میرے گھر میں آنے کے بعد ساری ذمہ داری مجھے سونپ دی۔ بھروسا کرتے تھے تو پورا کرتے تھے۔ بینک میں کتنا پیسہ ہے، پراپرٹی کتنی ہے۔ کوئی کسی پراپرٹی کے بارے میں بات کرے تو کہتے تھے مالتی جی سے پوچھ لو۔ میں چیک بک سامنے رکھتی تو سائن کر دیتے تھے کبھی پوچھتے نہیں تھے کہ کتنا پیسہ نکالا۔

میرے آنے کے بعد انہوں نے دنیاداری سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ اپنے کام میں پوری طرح سے ڈوب گئے تھے۔ وہ کبھی کسی کے یہاں شادی میں یا کسی پارٹی میں نہیں جاتے

تھے۔فلموں میں نامزدگی ہونے پر ایوارڈ فنکشن میں بھی نہیں جاتے تھے۔ میں اور میری بیٹی تحریر ہی جاتے تھے۔ان کا انجوائے کرنے کا طریقہ ہی الگ تھا۔تحریر کے آنے سے پہلے وہ روز رات کو گھر میں دوستوں کو اکٹھا کرکے پارٹی کرتے تھے۔ سب کو کھچڑی بنا کر کھلاتے تھے۔ نئی غزلوں کے کمپوزیشن بھی بناتے تھے۔

ان کو کمپوزیشن بنانے کا بہت شوق تھا۔کمل شُکل جواب اس دنیا میں نہیں ہیں، ان کے بہت گہرے دوست تھے اور شوقیہ کویتائیں لکھتے تھے۔ ان کی کویتائیں وہ بہت پسند کرتے تھے۔حسن کاظمی جوان کے بھائی جیسے تھے۔دھیریندر استھانا، سنجئے معصوم، پوران پنکج وغیرہ اپنی نئی کویتا ہمارے گھر آکر سناتے تھے۔دیر رات تک محفل چلتی رہتی تھی۔میں پروگرام میں زیادہ تر ندا جی کی غزلیں ہی گاتی ہوں۔ہم دونوں کے ایک ساتھ پروگرام بہت ہوئے ہیں۔تھوڑی دیر وہ رسائٹ کرتے تھے۔تھوڑی دیر میں گاتی تھی۔ان کے جانے سے پہلے پونہ میں ایسا ہی ایک پروگرام ہوا تھا۔'ایک شام ندا فاضلی کے نام'ہوش والوں کو خبر کیا' بہت بڑا مجمع تھا۔۱۹۹۸ء میں ان کی کتاب 'کھویا ہوا سا کچھ' کے لئے ساہتیہ اکادمی ایوراڈ ملا جو ان کے لئے بہت زیادہ معنی رکھتا تھا اور ۱۶/دسمبر ۱۹۹۹ء کو بیٹی تحریر کی پیدائش ہوئی جس سے ان کی خوشی دوبالا ہوگئی۔

بیٹی کے آنے کے بعد ان میں بہت تبدیلی آئی۔کھار کا فلیٹ چھوٹا پڑنے لگا۔انہوں نے بہت زیادہ محنت کرنا شروع کر دی۔ دوسرا فلیٹ تھوڑا بڑا ورسووا میں لے لیا۔اب وہ دن رات صرف کام ہی کرنے لگے۔ گھر کی محفلیں بند ہوگئیں۔ دھیرے دھیرے انہوں نے شراب پینا بالکل بند کر دی۔اس کے علاوہ گٹکا، بیڑی، تمباکو، پان یہ سب تو انہوں نے تحریر کے آتے ہی چھوڑ دیا تھا اور کھار سے ورسووا آتے آتے شراب بھی بالکل چھوڑ ہی دی تھی۔کبھی کوئی گھر پر باہر سے آجاتا تو منع نہیں کرتے تھے لیکن ایک پیگ لے کر بیٹھے رہتے تھے۔کچھ کچھ صوفیانہ جھلک مجھے ان میں دکھائی دینے لگی تھی۔

لدھیانہ کے ایک مشاعرے کا منظر

اہلیہ مالتی جوشی اور بیٹی تحریر کے ساتھ ندا فاضلی

پدم شری، اردو اکادمی ایوارڈ، شکھر سمان، غالبؔ ایوارڈ، سرفروش، سُر وغیرہ فلموں میں بہترین شاعر کا ایوارڈ، بہت سارے ایوارڈ اور اعزازات سے گھر بھرا ہوا تھا۔ایک کمرے میں لائبریری بنائی تھی جس میں ان کے علاوہ بہت سے بڑے قلمکاروں کی کتابیں ہیں۔ وہاں بیٹھ کر وہ اکثر کام کرتے تھے۔

ندا جی پوری دنیا گھوم چکے ہیں۔گجرات میں جب مشاعرے کے لئے جاتے تھے تو مجھے ساتھ لے کر جاتے تھے۔میں گجراتی ہوں تو مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔خاص طور سے جب ہم اسٹیج پر جاتے تھے تو اناؤنس ہوتا تھا کہ ہمارے داماد آ گئے۔کہا جاتا تھا کہ ہمیں بہت فخر ہے کہ ہمارے داماد ندا فاضلی ہیں۔ ان کی خود نوشت سوانح عمری جو اردو، ہندی اور مراٹھی میں شائع ہوئی ہے،'دیواروں کے بیچ' جو گجراتی میں 'دیواروںی بھیتر' کے نام سے راج کوٹ سے شائع ہوئی ہے۔

ان کی کئی کئی غزلیں میں نے گائی ہیں۔کچھ دن پہلے میں نے پنی ایک سی ڈی آن لائن ریلیز کی جس میں ندا جی کی چھ غزلیں ہیں۔آواز اور کمپوزیشن میرے ہیں۔اس کا عنوان ہے 'جب چاندنی رات' ندا جی کی غزلوں میں، نظموں میں شرنگار رس (عشقیہ موضوع) نہیں ہے۔لوگ عموماً محبوب یا محبوبہ پر کہتے ہیں لیکن ان کے یہاں ماں، بہن، بیٹی اور بچے موضوع ہوتے ہیں۔ماں کے لئے کہتے ہیں:

میں رویا پردیس میں بھیگا ماں کا پیار
دکھ نے دکھ سے بات کی بن چٹھی بن تار

بیسن کی سوندھی روٹی پر کھٹی چٹنی جیسی ماں
یاد آتی ہیں چوکا، باسن، چمٹا، پھکنی جیسی ماں

بہنوں کے لئے کہتے ہیں:

بہن چڑیا دھوپ کی دور گگن سے آئیں

ہر آنگن مہمان سی پکڑو تو اڑ جائیں
آنگن آنگن بٹیاں چھانٹی بانٹی جائیں
جیسے بالی گیہوں کی پکے تو کاٹی جائیں

بچوں کے لئے کہتے ہیں:

بچوں کے چھوٹے ہاتھوں کو
چاند ستارے چھونے دو
چار کتابیں پڑھ کر یہ بھی ہم
جیسے ہو جائیں گے
بچہ بولا دیکھ کر مسجد عالی شان
اللہ تیرے ایک کو اتنا بڑا مکان

والد کیلئے ان کی نظم بہت مشہور ہے۔ 'والد کی وفات پر'۔ ابھی حال میں دوہا بھی کہا ہے۔

مذہب کے لئے کہتے ہیں:

اندر مورت پر چڑھے گھی، پوری، مشٹھان
مندر کے باہر کھڑا ایشور مانگے دان
چاہے گیتا بانچئے یا پڑھئے قرآن
میرا تیرا پیار ہی ہر پستک کا گیان

بیٹی تحریر کے لئے انہوں نے بہت سی نظمیں کہی ہیں۔ جب ہم جے پور گئے تھے اس وقت تحریر پانچ سال کی تھی۔ جے پور کی شاپنگ پر لکھی ان کی یہ چھوٹی سی نظم ملاحظہ ہو:

گوٹے والی لال اوڑھنی
اس پے چولی گھاگھرا
اسی سے میچنگ کرنے والا
چھوٹا سا اک ناگرا
چھوٹی سی اک شاپنگ بھی یا کوئی جادو ٹونا
لمبا چوڑا شہرا چانک بن کے ایک کھلونا
داڑی، پگڑی، اونٹ چھوڑ کر
اتہاسوں کا جال توڑ کر
'آ' سے اماں، 'با' سے بابا بیٹھا بانچ رہا
پانچ سال کی بچی بن کر جے پور ناچ رہا

اس کو لوگ بہت پسند کرتے تھے۔ ہر مشاعرے میں اس کی فرمائش ہوتی تھی۔ وہ اسے آخر میں سناتے تھے۔

لکھنے کا ان کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ کبھی اپنے اسٹڈی روم میں بیٹھ کر لکھتے تھے، کبھی ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر، کبھی ٹی وی دیکھتے دیکھتے اچانک فون کر کے کسی پروڈیوسر یا میوزک ڈائرکٹر سے کہتے، یہ نیا مکھڑا کہا ہے یا نیا انترا اس میں ڈال سکتے ہیں۔ آر ڈی برمن سے لے کر آدیش شریواستو تک سب کے ساتھ انہوں نے کام کیا۔ آدیش کے ساتھ ان کی دوستی اور ٹیوننگ بہت اچھی تھی۔

بہت سے لوگ، جب ان کے گھر بچے پیدا ہوتے تو ان سے بچوں کے نام رکھنے کو کہتے تھے۔ ان میں ایک مشہور گائکہ پروین سلطانہ کے گھر بچہ ہوا تو ان کے شوہر ندا صاحب سے نام کے بارے میں مشورہ کرنے آئے تھے۔ ان کا گھر ہمارے گھر کے قریب ہی تھا تو میں نے بھی ہماری بیٹی کا نام رکھنے کے لئے کہا تو انہوں نے تحریر نام بتایا جو کہ بالکل درست تھا۔ ایک قلمکار کی بیٹی کا نام یہی ہونا چاہئے تھا۔ کئی سال ہم نے ساتھ گزارے۔ بہت اچھے گزارے۔ آخر میں دو دن کے لئے مشاعرے میں لکھنؤ اور گورکھپور گئے تھے۔ جب لوٹے تو تھوڑا سا زکام اور بخار لے کے آئے۔ سنیچر اور اتوار دو دن بیمار رہے اور سوموار ۸ر فروری ۲۰۱۶ء کو صبح ناشتہ بنا کر، چائے تیار کر کے ان کے اٹھنے کا انتظار کرتی رہی۔ دس بجے تک جب وہ نہیں اٹھے تو میں اٹھانے کے لئے قریب گئی تو اٹھ ہی نہیں سکے۔

ایسا لگا اب جینے کا مقصد ہی ختم ہو گیا۔ ماں کے جانے سے جو خالی پن آ گیا تھا وہی پھر سے آ گیا ہے۔

ایسے وقت میں مجھے ندا جی کا ہی ایک شعر یاد آتا ہے:

اپنا غم لے کے کہیں اور نہ جایا جائے
گھر میں بکھری ہوئی چیزوں کو سجایا جائے

❑❑❑

(ہندی سے اردو ترجمہ: نجیب انصاری)

انو ملک، انورادھا پوڈوال وغیرہ کے ساتھ ندا فاضلی۔ جب ایل پی رکارڈ بنتے تھے ان دنوں ایک گانے کی رکارڈنگ کے وقت کی تصویر

ٹی وی سیریل نور جہاں کے سیٹ پر ندا فاضلی، طلعت عزیز وغیرہ

بشیر بدر شاعر نہ ہوتے تو جہاں بھی ہوتے کمال ہی کر رہے ہوتے

راحت بدر

ادیب و شاعر

دو سفر ناموں سمیت

کئی کتابوں کی مصنفہ

کئی ادبی جرائد کی ادارت

مختلف موضوعات پر مضامین

کی اشاعت، وطن بھوپال

۱۱، ریحانہ کالونی، عیدگاہ ہلز،

بھوپال (مدھیہ پردیش)

رابطہ: 9425007018

ایک شاعر کی بیوی ہونے پر کیسا محسوس کرتی ہیں۔ افسوس تو نہیں؟

شاعر (بشیر بدر) کی بیوی ہونے پر فخر محسوس کرتی ہوں۔ اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔ بشیر بدر جیسا شوہر ہر کروڑوں میں ایک ہوتا ہے اور ایسے انسان تو بہت مشکل سے پیدا ہوتے ہیں۔ شاعر کی بیوی ہونے پر تو دلی خوشی محسوس کرتی ہوں۔ 'افسوس' کا لفظ تو وہم و گمان میں بھی نہیں ہے۔

ایک بات اور بشیر بدر صاحب کے بارے میں کہہ سکتی ہوں کہ اگر یہ شاعر نہ ہو کر جو بھی پروفیشن اختیار کرتے، کچھ نہ کچھ کمال ہی کر کے دکھاتے۔ جس طرح جدید شاعری میں چار چاند لگا دئے ہیں۔

وہ کون سا دور یا لمحہ تھا جب آپ ان کی شاعری سے جھلاہٹ محسوس کرنے لگیں تھیں یا ایسا کبھی نہیں ہوا؟

شاعر ہونے کی خوبی بشیر بدر صاحب میں سب سے بڑی یہ ہے کہ بغیر کسی کی فرمائش کے شعر کبھی نہیں سناتے۔ آج بھی یہی حال ہے۔ ایسے شاعروں سے شاید گھر والے اور دوست احباب گھبراتے ہوں گے جو پیچھے پڑ کر اپنی شاعری سناتے ہیں اور لوگ ان کو دیکھ کر بھاگنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔

مجھے نیا شعر سنا کر اس پر تنقیدی گفتگو چاہتے تھے تاکہ شعر کو اور زیادہ خوب صورت بنا سکیں۔

کیا وہ اپنی زندگی کے معاملات میں بھی شاعرانہ ہیں؟

جس انسان کو اللہ کی طرف سے شاعری عطا ہوتی ہے وہ تو ہر وقت شاعر ہی ہوتا ہے۔ ملنسار، خوش اخلاق، ہمدرد، بے انتہا محبت کرنے والا، بے لوث خدمت کرنے والا۔ الحمدللہ یہ تمام خوبیوں کے مالک میں بشیر بدر صاحب اور یہ مزاج صرف گھر والوں کے لئے نہیں ہے بلکہ ہر ایک کے ساتھ یہی برتاؤ رہا ہے چاہے کوئی بھی ہو۔

ذاتی زندگی میں کبھی ان کی شاعری آڑے آئی؟

ذاتی زندگی میں مشفق باپ، محبت کرنے والے شوہر اور اپنے تمام رشتہ داروں کے لئے بہت شفیق اور مہربان کا رول ادا کیا ہے۔ شاعری اپنی جگہ رہی ان کے بچوں سے لے کر بہن بھائی اور تمام چاہنے والوں نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ شاعری کرنے کی وجہ سے (بشیر) یہ ان سے دور یا غافل رہے ہوں۔

مشاعروں میں زیادہ تر باہر رہتے تھے، تب گھر کی ذمہ داری آپ نے اکیلے سنبھالی۔ کوئی مایوسی یا دکھ؟

اللہ نے جب سے ہم دونوں کو ایک دوسرے کا ساتھ دیا الحمد للہ انہوں نے مجھے تنہا بہت کم چھوڑا اور ایک شعر جو مجھے اکثر سناتے تھے:

وہ دھوپ کے چھپر ہوں یا چھاؤں کی دیواریں
اب جو بھی اٹھائیں گے مل جل کے اٹھائیں گے

گھر کے کام کرنے میں جہاں ساتھ جانے کی ضرورت ہوتی تھی بہت خوشی سے جاتے تھے۔ الحمدللہ مایوسی کا تو کبھی بھی سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔

بشیر بدر کی بیوی ہونے پر فخر سب سے زیادہ کس بات پر ہوتا ہے؟

مجھے اللہ کا شکر ادا کرنے کے لئے دس جنم بھی مل جائیں تو وہ بھی کم ہیں۔ اللہ نے ایسا اچھا زندگی کا ساتھی دیا ہے جس کی خواہش شاید ہر لڑکی کرتی ہوگی۔

ایک خوب سیرت انسان کی بیوی ہونے پر مجھے بے انتہا خوشی ہے۔ آپ اس کو فخر بھی کہہ سکتے ہیں۔

کیا کبھی سوچا تھا کہ شاعر کی بیوی بنیں گی؟

اللہ کے بھید وہی جان سکتا ہے۔ ہم گنہگار بندے کیسے سوچ سکتے ہیں۔ یہ سب قسمت میں اللہ نے لکھا۔ خود کاتب تقدیر نے مجھے یہ انعام دیا۔

کب لکھتے ہیں؟

آج کل تو نہیں لکھ رہے ہیں۔ ویسے کوئی مقررہ وقت نہیں تھا۔ رات، دن سفر میں، گھر میں جب آمد ہو جائے، لکھ لیتے تھے۔

کس پہر میں زیادہ موزوں رہتے ہیں؟

ہر پہر میں موزوں رہتے تھے۔ موزوں

قطر کے ایک مشاعرے میں غزل سرا بشیر بدر

طبع تھے اور آج بھی ہیں۔ شعر کہہ کر مطمئن ہونے کے لئے الفاظ بدلتے رہتے تھے۔ مثلاً یہ شعر

خدا ایسے احساس کا نام ہے
رہے سامنے اور دکھائی نہ دے

اس میں احساس کی جگہ عرفان بھی کہا تھا اور اب

مامون ایمن، جمیر ارحمان اور پروین شاکر کے ساتھ بشیر بدر

جو تبدیلی کی تھی اس میں

خدا ایسے ایمان کا نام ہے
رہے سامنے اور دکھائی نہ دے

کہا ہے۔

لاابالی ہیں یا نہیں؟ جیسے عام طور پر شاعر ہوتے ہیں۔

لا ابالی تو الحمد للہ بالکل نہیں۔ شاعر ہونے کی یہ سب سے بڑی خوبی ہے کہ اچھی اور اعلیٰ معیار کی شاعری کرنے کے ساتھ ایک میسج ہوتا ہے شاعری میں۔

اس کے علاوہ بیڑی، سگریٹ، پان، سپاری، لونگ الائچی، تمباکو کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ الحمدللہ

بشیر صاحب جب سے بیمار ہوئے، اس وقت سے آپ کے معمولات زندگی پر کیا فرق پڑا ہے؟

بشیر بدر صاحب جب سے صاحب فراش ہوئے ہم ان کے ساتھ ان ہی کے کاموں میں زیادہ مصروف ہو گئے۔ زندگی کے معمولات میں ان کی پوری پوری مدد کرنا ہوتی ہے۔ داڑھی رکھنا کبھی پسند نہیں کیا۔ اس لئے ہم ان کے باربر (نائی) پہلے تھے اور بال کٹ کرتے تھے۔ اب شیو بھی کرتے ہیں۔ بہت خوش ہوکر دعائیں دیتے ہیں اور اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ آپ میرے لئے بہت کام کرتی ہو۔

اللہ بشیر صاحب کو صحت دے۔ (آمین)

ان کے (بشیر صاحب) دوستوں میں بحیثیت شاعر آپ سب سے زیادہ کس سے متاثر ہیں؟

بشیر بدر صاحب کے تو سینئر اور جونیئر سبھی شاعر دوست تھے اور ہر ایک کو وہ پسند کرتے تھے۔ کہتے تھے سب اچھا شعر کہنے کی دوڑ میں شامل ہیں۔ اللہ جس کو اچھا شعر عطا کر دے گا وہ دلوں میں زندہ رہے گا۔

میں نے پی ایچ ڈی جدید غزل پر کی ہے اور اپنے تمام پسندیدہ شعراء کو جنہوں نے جدید غزل میں کوئی نہ کوئی کارنامہ کیا ہے۔

آپ شادی سے پہلے ہی ادبی دلچسپی رکھتی تھیں یا شادی کے بعد آپ کو ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی؟

جی ہاں، شادی سے پہلے سے ادبی دلچسپی رکھتی تھی۔ ہمارے والد سید فتح علی صاحب مرحوم اردو فارسی کے اشعار بہت شوق سے سناتے تھے۔ ہمارے ماموؤں کو ادب سے بڑا لگاؤ تھا۔

ہمارے گھر میں ادبی محفلیں ماموں کے دوستوں کی ہوتی تھیں۔ ہماری بڑی بہن ڈاکٹر رضیہ حامد نے ہم لوگوں کو بھی اس میں شامل رکھا اور آپ کو یہ سن کر لطف آئے گا کہ میرا پسندیدہ شعر تھا اور ہے:

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

تب مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ شعر کس شاعر کا ہے۔ اپنے ایک استاد سے جب میں نے آٹوگراف لئے تو انہوں نے بھی یہی شعر لکھ کر مجھے دیا۔ میں نے پوچھا کس کا شعر ہے سر؟ بولے مجھے بھی نہیں معلوم۔ پھر 'حریم' رسالے میں کسی افسانہ نگار نے 'بشیر بدر نے کہا ہے' لکھ کر شعر کا استعمال کیا تب معلوم ہوا۔

معاصر شعراء میں کون کون ہیں جن کی شاعری آپ پسند کرتی ہیں؟

اس وقت جتنے شعراء حضرات ہیں مجھے تو سبھی کا کوئی نہ کوئی شعر پسند ہے لیکن بشیر بدر صاحب کی علالت کے سبب اب کافی عرصے سے کسی کو سنا نہیں۔

آپ کی شادی کب ہوئی؟ آپ کو کب پتہ چلا کہ آپ ایک شاعر کی زوجہ ہیں؟

۲۰۱۶-۱۷ء کا یش بھارتی ایوارڈ حاصل کرنے کے موقع پر بشیر بدر

میری شادی ۴/جون ۱۹۸۸ء کو ہوئی اور شادی سے پہلے بتا دیا گیا تھا کہ شاعر سے شادی ہو رہی ہے۔

آپ کی زندگی کا کوئی ایسا ادبی واقعہ جسے سوچ کر آج بھی آپ کو خوشگوار کیفیت کا احساس ہوتا ہے؟

'نئے موسموں کا پتہ' ڈاکٹر بشیر بدر؛ فن اور شخصیت؛ مرتبین عشرت قادری اور ڈاکٹر راحت بدر، کا احمد فراز کے ہاتھوں اجراء

میری زندگی کا ادبی واقعہ تو یہی ہے جب میں اردو غزل کے جدید شاعر بشیر بدر صاحب سے پہلی بار ملی۔ میں ۱۹۸۷ء میں حج کر کے آئی تھی اور دہلی میں ایک جگہ بشیر بدر صاحب ملے تو میں نے ان کو خانۂ کعبہ کا پوسٹ کارڈ لے کر اس پر ان کا ہی شعر اس طرح لکھ کر دیا:

اے اللہ کے گھر
اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو

بہت خوش ہوئے اور مذاق میں بولے، اب جب آپ آجائیں تو ہم کو بھی لے چلئے گا۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔ ہم دونوں نے ۲۰۰۸ء میں ساتھ حج کیا۔

بشیر صاحب کی زندگی کے کچھ اہم شاعرانہ پہلوؤں کے بارے میں بتانا پسند کریں گی، جس کے بارے میں لوگ کم جانتے ہوں؟

بشیر بدر صاحب تو ماشاءاللہ آپ سب کے لئے کھلی کتاب ہیں۔ ان کے شاعرانہ پہلوؤں سے آپ سب واقف ہیں۔ بشیر بدر محب وطن انسان اور شاعر ہیں۔ وہ محبت کے شاعر تو ہیں یہی اس کے علاوہ اپنی مٹی سے جڑے ہوئے شاعر ہیں۔ اپنے خوب صورت وطن اور اس کی خوبیوں کو شاعری میں اتارا ہے۔ اس غزل میں گاؤں کا منظر بھی ہے:

سنسان راستوں سے سواری نہ آئے گی
اب ڈھول سے اٹی ہوئی لاری نہ آئے گی
چھپر کے چائے خانے بھی اب اونگھنے لگے
پیدل چلو کہ کوئی سواری نہ آئے گی
تحریر و گفتگو میں کسے ڈھونڈھتے ہیں لوگ
تصویر میں بھی شکل ہماری نہ آئے گی
سر پر زمین لے کے ہواؤں کے ساتھ جا
آہستہ چلنے والے کی باری نہ آئے گی
پہچان ہم نے اپنی مٹائی ہے اس طرح
بچوں میں کوئی بات ہماری نہ آئے گی

پرانی روایات، پرانے طور طریقے بشیر بدر صاحب کو بہت پسند ہیں۔ ہمارے والد صاحب کا گھر کافی بڑا تھا جس میں صحن، دالان، آنگن اور ہر طرح کے پھلوں کے درخت موجود تھے۔

تمام بہن بھائی اپنے اپنے گھر کے ہوئے اور اس قدیم گھر کی جگہ فلیٹ بنا دئے گئے۔تب بشیر بدر صاحب نے یہ شعر کہا۔

کیوں حویلی کے اجڑنے کا مجھے افسوس ہو
سینکڑوں بے گھر پرندوں کے ٹھکانے ہو گئے

قصباتی فضا، پرانی یادیں، گھروں کا ماحول، ان سب کی عکاسی ان اشعار میں ملاحظہ کیجئے۔

بھٹک رہی ہے پرانی دلائیاں اوڑھے
حویلیوں میں میرے خاندان کی خوشبو

سنا کے کوئی کہانی ہمیں سلاتی تھی
دعاؤں جیسی بڑے پاندان کی خوشبو

وہ عطردان سا لہجہ میرے بزرگوں کا
رچی بسی ہوئی اردو زبان کی خوشبو

بشیر بدر صاحب نے بچوں کے لئے قومی ترانے بھی لکھے ہیں جو ہندی میں وانی پبلشر نے چھاپے ہیں۔

آپ کی ذاتی رائے کیا ہے بشیر صاحب کی شاعری سے متعلق؟

بشیر بدر صاحب پر ڈاکٹر رضیہ حامد نے فکر آگہی بشیر بدر نمبر بھی نکالا تھا جو ہماری شادی سے پہلے شائع ہوا تھا۔

اپنے پرستاروں سے گھرے بشیر بدر

۱۹۷۸ء میں منعقد دہلی کے ڈی سی ایم مشاعرہ کے شرکاء کی ایک یادگار گروپ تصویر۔بشیر بدر (دائیں)

اس وقت ان کی مدد میں نے بھی کی تھی، کیونکہ میرے پسندیدہ شاعر تھے لیکن اللہ کا ایسا حکم ہو جائے گا کہ مجھے ان کا نصف بہتر ہونے کا شرف حاصل ہو جائے گا میرے علم میں نہیں تھا۔

میری ذاتی رائے بشیر بدر صاحب کی شاعری سے متعلق یہ ہے کہ آسان زبان میں بڑے سے بڑے مضمون کو شاعری میں لانا اور بغیر کسی محنت کے عوام کے دل و دماغ میں بٹھا دینا، کوئی آسان کام نہیں تھا۔

غزل کو آسان زبان دی، سنجیدہ غزل میں انگریزی کے الفاظ لانا یہ بشیر بدر کا ہی کارنامہ ہے۔مزاحیہ غزل میں تو انگریزی الفاظ داخل تھے۔

بشیر بدر کی شاعری کی تازگی ماشاءاللہ ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ ہزاروں شعر غزل کے سمندر میں نایاب موتی ہیں۔

بشیر بدر نے آج کے انسان کی نفسیات کی ترجمانی غزلیہ اسلوب میں کی ہے۔

مجھے یہ لکھنے میں فخر محسوس ہو رہا ہے کہ ہندوستان، پاکستان علاوہ اور جہاں جہاں اردو بولی سمجھی جاتی ہے، غزل کے بیحد محبوب شاعر بشیر بدر ہیں۔

اللہ ان کو جلد صحت عطا کرے اور طویل حیات دے۔(آمین)

❑❑❑

(انٹرویو: سہیل وحید)

شریف الحسن نقوی، حیات اللہ انصاری، ذہین نقوی اور بشیر بدر (دائیں)

بشیر بدر

غزل

لہو پکارتا ہے روشنی کے پیکر دے
زمینیں چیخ رہی ہیں ہمیں پیمبر دے

یہ آب سیدھا چلا جا رہا ہے بڑھتا ہوا
کوئی چٹان بنے سینہ سامنے کر دے

کہاں سے ذہن میں اک دم مرے خیال آیا
گلاس خالی ہے اس میں کوئی لہو بھر دے

ذرا سا سر ہے مگر اس میں ایک صحرا ہے
اسی طرح مری آواز کو سمندر دے

تمام تاروں کو چھوتا ہوا گزر جاؤں
کمان بن کے مجھے تیر سا رواں کر دے

اندھیرے کمرے میں سب لوگ اب برہنہ ہیں
کسی کا ہاتھ بڑھے اور روشنی کر دے

کھلے سے لان میں سب لوگ بیٹھیں چائے پئیں
دعا کرو کہ خدا ہم کو آدمی کر دے

غزل

پلک جھپکتے ہی یہ رات وار کر دے گی
سجا کے چاند کی کشتی میں میرا سر دے گی

چڑھے گا سوکھے بدن میں لہو کا فوارہ
یہ سرخ چاندنی خالی گلاس بھر دے گی

یہ نرم بلی جو سوئی ہے میرے سینے پر
میں سو گیا تو کلیجہ ہی چاک کر دے گی

بدن کے پیڑ کو خود اس کی شاخ کاٹے گی
یہی تراش زمیں کو نیا شجر دے گی

بہار اب کے لہو کے چڑھے سمندر کو
قلم کئے ہوئے بازو بریدہ سر دے گی

اسی خیال سے پتھر ہے بیچ پانی میں
کوئی تو موج گہر کی اسے خبر دے گی

طوافِ دائرہ اب پہلی بار ٹوٹا ہے
یہ رہگذر ہمیں اک اور رہگذر دے گی

بٹھا کے پیٹھ پہ بکری کے بچے گھومیں گے
یہ دنیا اب ہمیں سرکس کا شیر کر دے گی

بشیر بدر

غزل

شاید مرے آنسو سے اس کا کوئی رشتہ ہے
تپتے ہوئے صحرا میں جو پھول اکیلا ہے

جھنجھلا کے کسی لمحہ وہ توڑ بھی سکتا ہے
اک بچے کی انگلی سے لپٹی رگ دنیا ہے

سناٹے کی شاخوں پر کچھ زخمی پرندے ہیں
خاموشی بذات خود آواز کا صحرا ہے

ہو سکتا ہے کل سورج سوتا ہی مجھے پائے
اک سانپ مرے دل میں سمٹا ہوا بیٹھا ہے

کب جانے ہوا اس کو بکھرا دے فضاؤں میں
خاموش درختوں پر سہما ہوا نغمہ ہے

اب روئے کہاں ساون اب تڑپے کہاں بادل
آنگن نہ بغیچہ ہے اک چھوٹا سا کمرہ ہے

ٹھہری ہوئی جھیلوں میں اک برقِ رواں جیسے
ان حیرتی آنکھوں میں یوں 'دوڑتی دنیا' ہے

جیسے ورقِ گُل پر انگارہ کوئی رکھ دے
یوں دستِ حنائی پر آنسو ابھی ٹپکا ہے

غزل

تیرا ہاتھ مرے کاندھے پر دریا بہتا جاتا ہے
کتنی خاموشی سے دکھ کا موسم گزرا جاتا ہے

نیم پہ اٹکے چاند کی پلکیں شبنم سے بھر جاتی ہیں
سونے گھر میں رات گئے جب کوئی آتا جاتا ہے

پہلے اینٹیں، پھر دروازے اب کے چھت کی باری ہے
یاد نگر میں ایک محل تھا وہ بھی گرتا جاتا ہے

راکھ ہوئیں آنکھوں کی شمعیں آنسو بھی بے نور ہوئے
دھیرے دھیرے میرا دل پتھر سا ہوتا جاتا ہے

اپنا دل ہے ایک پرندہ جس کے بازو ٹوٹے ہیں
حسرت کے بادل کو دیکھے بادل اڑتا جاتا ہے

ساری رات برسنے والی بارش کا میں آنچل ہوں
دن میں کانٹوں پر پھیلا کر مجھ کو سکھایا جاتا ہے

ہم نے تو بازار میں دنیا بیچی اور خریدی ہے
ہم کو کیا معلوم کسی کو کیسے چاہا جاتا ہے

بشیر بدر

غزل

یونہی بے سبب نہ پھرا کرو، کوئی شام گھر میں رہا کرو
وہ غزل کی سچی کتاب ہے اسے چپکے چپکے پڑھا کرو

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلہ سے ملا کرو

ابھی راہ میں کئی موڑ ہیں کوئی آئے گا کوئی جائے گا
تمہیں جس نے دل سے بھلا دیا اسے بھولنے کی دعا کرو

مجھے اشتہار سی لگتی ہیں یہ محبتوں کی کہانیاں
جو کہا نہیں وہ سنا کرو، جو سنا نہیں وہ کہا کرو

کبھی حسن پردہ نشیں بھی ہو ذرا عاشقانہ لباس میں
جو میں بن سنور کے کہیں چلوں مرے ساتھ تم بھی چلا کرو

نہیں بے حجاب وہ چاند سا کہ نظر کا کوئی اثر نہ ہو
اسے اتنی گرمیٔ شوق سے بڑی دیر تک نہ تکا کرو

یہ خزاں کی زردسی شال میں جو اداس پیڑ کے پاس ہے
یہ تمہارے گھر کی بہار ہے اسے آنسوؤں سے ہرا کرو

غزل

وہ بجھے گھروں کا چراغ تھا یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو
اسے لے گئی ہے کہاں ہوا، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

کئی لوگ جان سے جائیں گے مرے قاتلوں کی تلاش میں
مرے قتل میں مرا ہاتھ تھا، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

وہ تمام دنیا کے واسطے جو محبتوں کی مثال تھا
وہی اپنے گھر میں تھا بے وفا، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

کہیں مسجدوں میں شہادتیں، کہیں مندروں میں عدالتیں
یہاں کون کرتا ہے فیصلہ، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

مرے پاس جتنی ہے روشنی ہے یہی چراغ کی زندگی
میں کہاں جلا، میں کہا بجھا، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

مجھے جان کر کوئی اجنبی وہ دکھا رہے ہیں گلی گلی
اسی شہر میں مرا گھر بھی تھا، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

وہ سمجھ کے دھوپ کے دیوتا مجھے آج پوجنے آئے ہیں
میں چراغ ہوں تری شام کا، یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

بشیر بدر

غزل

خوشبو کو تتلیوں کے پروں میں چھپاؤں گا
پھر نیلے نیلے بادلوں میں لوٹ جاؤں گا

دیوانہ وار مجھ سے لپٹ جائے گی ہوا
میں سرخ سرخ پھولوں میں جب مسکراؤں گا

سونے کے پھول پتے گریں گے زمین پر
میں زرد زرد شاخوں پہ جب گنگناؤں گا

یہ لکڑیاں جو خشک ہیں بے برگ و بار ہیں
ان کو میں اپنی آگ میں جلنا سکھاؤں گا

ڈھل جائیں گی بدن پہ جمی دھوپ کی تہیں
اپنے لہو میں آج میں ایسا نہاؤں گا

اک پل کی زندگی مجھے بے حد عزیز ہے
پلکوں پہ جھلملاؤں گا اور ٹوٹ جاؤں گا

یہ رات پھر نہ آئے گی بادل برسنے دے
میں جانتا ہوں صبح تجھے بھول جاؤں گا

جب رات کے سپرد مجھے کرنے آؤ گے
رومال روشنی کا ہوا میں اڑاؤں گا

آنگن میں ننھے ننھے فرشتے لڑیں گے جب
بھوری شفیق آنکھوں میں میں مسکراؤں گا

غزل

بدر، دو آنکھیں بہت ڈھونڈ رہی ہیں تم کو
چاند کی چودھویں تاریخ ہے، اوپر دیکھو

رات سوئی ہوئی رعنائیوں نے مجھ سے کہا
ہم تمہاری ہی غزل ہیں کبھی ہم کو بھی کہو

چاندنی رات میں کہہ جاتی ہے آہٹ جیسے
ہم بہت پاس ہیں آواز نہ دو، ہم کو سنو

جس سے امید وفا ہوگی وہی دکھ دے گا
بے وفا جان کے چاہو جسے اب کی چاہو

اس کی قدرت میں نہیں رک کے کوئی بات سنے
وقت آواز ہے آواز کو آواز نہ دو

منتظر کب سے ہیں اوراق کتاب ہستی
دل کا کچھ رنگ کرو نوک قلم کو چومو

ایک آواز بہت کافی ہے سوتے کے لئے
لوگ سمجھیں گے بنے لیٹے ہو اب جاگ پڑو

آج کمرے میں نہیں بیٹھنے والا موسم
برف گرنے کی خبر گرم ہے گھر سے نکلو

بشیر بدر

غزل

شبنم ہوں سرخ پھولوں پہ بکھرا ہوا ہوں میں
ہوں موم اور دھوپ میں بیٹھا ہوا ہوں میں

کچھ دیر بعد راکھ ملے گی تمہیں یہاں
لَو بن کے اس چراغ سے لپٹا ہوا ہوں میں

دنیا ہے بے پناہ تو بھرپور زندگی
دو عورتوں کے بیچ میں لیٹا ہوا ہوں میں

جو ایک شیرخوار کے لب تر نہ کر سکے
ایسے سپاٹ سینے سے چمٹا ہوا ہوں میں

دو سخت خشک روٹیاں کب سے لئے ہوئے
پانی کے انتظار میں بیٹھا ہوا ہوں میں

لادی اٹھا کے گھاٹ پہ جانے لگے ہرن
کیسے عجیب دور میں پیدا ہوا ہوں میں

خود میرا ہاتھ بھی نہ پہنچ پائے گا کبھی
اتنے بلند طاق پہ رکھا ہوا ہوں میں

اس کو ہی لوگ چوم کے فنکار ہو گئے
جس ریشمی غلاف میں لپٹا ہوا ہوں میں

بہتر ہوں لوٹ جاؤں میں اپنی زمین پر
کس آس پر خلاؤں میں لٹکا ہوا ہوں میں

نس نس میں پھیل جاؤں گا بیمار رات کی
پلکوں پہ آج شام سے سمٹا ہوا ہوں میں

اوراق میں چھپاتی تھی اکثر وہ تتلیاں
شاید کسی کتاب میں رکھا ہوا ہوں میں

سبزے میں انکسار و قناعت تلاش کر
گل ہوں، اگرچہ شاخ سے ٹوٹا ہوا ہوں میں

دریاؤں اور نہروں کی سینچی ہوئی ہے وہ
چھت چھت ہزار بار کا برسا ہوا ہوں میں

گنبد ہوں اپنے عہد کی سنسان رات کا
تنہائیوں کی گونج سے گونجا ہوا ہوں میں

بشیر بدر

غزل

صبح کا جھرنا ہمیشہ ہنسنے والی عورتیں
جھیلوں کی ندیاں خاموش گہری عورتیں

معتدل کر دیتی ہیں یہ سرد موسم کا مزاج
برف کے ٹیلوں پہ چڑھتی دھوپ جیسی عورتیں

سبز، نارنجی، سنہری، کھٹی، میٹھی لڑکیاں
بھاری جسموں والی ٹپکے آم جیسی عورتیں

سڑکوں، بازاروں، مکانوں، دفتروں میں رات دن
لال، پیلی، سبز، نیلی جلتی بجھتی عورتیں

شہر میں اک باغ ہے اور باغ میں تالاب ہے
تیرتی ہیں اس میں ساتوں رنگ والی عورتیں

سیکڑوں ایسی دکانیں ہیں جہاں مل جائیں گی
دھات کی، پتھر کی، شیشے کی ربر کی عورتیں

منجمد ہیں برف میں کچھ آگ کے پیکر ابھی
مقبروں کی چادریں ہیں پھول جیسی عورتیں

ان کے اندر پک رہا ہے وقت کا آتش فشاں
کن پہاڑوں کو ڈھکے ہیں برف جیسی عورتیں

آنسوؤں کی طرح تارگر رہے ہیں عرش سے
رو رہی ہیں آسمانوں کی اکیلی عورتیں

غور سے سورج نکلتے وقت دیکھو آسماں
چومتی ہیں کس کا ماتھا اجلی لمبی عورتیں

فاختائیں، تتلیاں، مچھلی ، گلہری، بلیاں
زندگی میں آئیں اپنی کیسی کیسی عورتیں

سبز سونے کے پہاڑوں پر قطار اندر قطار
سر سے سر جوڑے کھڑی ہیں لانبی لانبی عورتیں

اک غزل میں سیکڑوں افسانے، نظمیں اور گیت
اس سراپے میں چھپی ہیں کیسی کیسی عورتیں

واقعی دونوں بہت مظلوم ہیں نقاد اور
ماں کہے جانے کی حسرت میں سلگتی عورتیں

بشیر بدر

غزل

چمک رہی ہے پروں میں اڑان کی خوشبو
بلا رہی ہے بہت آسمان کی خوشبو

بھٹک رہی ہے پرانی دلائیاں اوڑھے
حویلیوں میں مرے خاندان کی خوشبو

سنا کے کوئی کہانی ہمیں سلاتی تھی
دعاؤں جیسی بڑے پان دان کی خوشبو

دبا تھا پھول کوئی میز پوش کے نیچے
گرج رہی تھی بہت پیچوان کی خوشبو

عجب وقار تھا سوکھے سنہرے بالوں میں
اداسیوں کی چمک زرد لان کی خوشبو

وہ عطر دان سا لہجہ مرے بزرگوں کا
رچی بسی ہوئی اردو زبان کی خوشبو

غزل کی شاخ پہ اک پھول کھلنے والا ہے
بدن سے آنے لگی زعفران کی خوشبو

عمارتوں کی بلندی پہ کوئی موسم کیا
کہاں سے آ گئی کچے مکان کی خوشبو

گلوں پہ لکھتی ہوئی لا الہ الا اللہ
پہاڑیوں سے اترتی اذان کی خوشبو

غزل

تاروں بھری پلکوں کی برسائی ہوئی غزلیں
ہے کون پروئے جو بکھرائی ہوئی غزلیں

وہ لب ہیں کہ دو مصرعے اور دونوں برابر کے
زلفیں کہ دل شاعر پر چھائی ہوئی غزلیں

یہ پھول ہیں یا شعروں نے صورتیں پائی ہیں
شاخیں ہیں کہ شبنم میں نہلائی ہوئی غزلیں

خود اپنی ہی آہٹ پر چونکے ہوں ہرن جیسے
یوں راہ میں ملتی ہیں گھبرائی ہوئی غزلیں

ان لفظوں کی چادر کو سرکاؤ تو دیکھو گے
احساس کے گھونگھٹ میں شرمائی ہوئی غزلیں

اس جان تغزل نے جب بھی کہا کچھ کہئے
میں بھول گیا اکثر یاد آئی ہوئی غزلیں

کہاں کی شمعیں ہیں
کن محفلوں میں جلتی ہیں

وسیم بریلوی

بین الاقوامی شہرت یافتہ
منفرد، ممتاز اور محبوب شاعر
بریلی کالج، بریلی (روہیل کھنڈ یونیورسٹی)
کے ڈین فیکلٹی آف آرٹس
کے عہدے سے سبکدوش
کئی ملکی وغیر ملکی اعزازات سے سرفراز
آٹھ شعری مجموعہ اردو میں
اور دو شعری مجموعے ہندی میں شائع
وطن مراد آباد

۵، جمنا پرساد روڈ، بریلی
رابطہ: 9412485477

تمام عمر مرا دم اسی دھویں میں گھٹا
وہ اک چراغ تھا میں نے اسے بجھایا تھا

ہم سے مجبور کا غصہ بھی عجب بادل ہے
اپنے ہی دل سے اٹھے اپنے ہی دل پر برسے

سر سے چادر بدن سے قبا لے گئی
زندگی ہم فقیروں سے کیا لے گئی

خدا ایسے احساس کا نام ہے
رہے سامنے اور دکھائی نہ دے

اردو غزل کو ایسی فکر انگیز معنویتوں کے شعر دینے والا شاعر تخلیقی سطح پر کیا کارنامہ انجام نہیں دے سکتا، کہنے کی ضرورت نہیں۔ چاہتا تھا کہ اپنے رفیق، اپنے دوست، مہینے میں دس سے بارہ رت جگوں کے وعدہ معاف گواہ، غم گسار، ساجھے دار بشیر بدر کے بارے میں کھل کر لکھوں، تفصیل سے بات کروں، غزل کی زبان میں ہم سفری کے وہ تعلق آزما لمحے بھی دہراؤں جنہیں میرا یہ شعر بیان کرتا ہے:

عجب دشمن ہے ظالم ساتھ بھی میرا نہ چھوڑے گا
مگر مجھ کو ڈبونے کا کوئی موقع نہ چھوڑے گا

لیکن شب و روز کی مسلسل تگ و دو نے مہلت ہی نہ دی کہ عزیزم سہیل وحید کے اصرار سے پوری طرح سرخرو ہو پاتا لہٰذا تفصیلی گفتگو آئندہ پر چھوڑتا ہوں جس میں بشیر بدر کی شخصیت کے بوجھے ان بوجھے بہت سے پہلو بطور خاص شامل ہوں گے۔ فی الحال تو یہی کہنا چاہوں گا کہ کئی برسوں سے اردو دنیا ان کی من موہک جھلک پانے کو ترس رہی ہے مگر وہ ایسی مہلک اور موذی بیماری سے جنگ کر رہے ہیں جس نے انہیں صاحب فراش بنا دیا ہے۔

آیئے! میرے ساتھ ان کے ان گنت چاہنے والوں کی ایک دنیا ان کی صحت کلی اور درازیٔ عمر کی دعا

کرے کہ ان کا ہنستا کھیلتا جاگتا چہرہ حوصلہ شکن بیماری کے بادلوں کی اوٹ سے نکلے اور پھر سے مقبولیت کی آنکھوں کا تارا بنے۔

۱۹۷۰ء کے آس پاس بشیر بدر مشاعروں کے افق پر نمودار ہوئے، رسائل میں پہلے ہی سے چھپ رہے تھے مگر مشاعروں کے اسٹیج پر آنے کی ان کی شدید چاہ کو پَر دینے میں کہیں نہ کہیں خاکسار کی پیروی کو بھی دخل رہا۔ جہاں ۱۹۶۱ء سے میری موجودگی علمی اور ادبی پس منظر کے شعراء کو بھی مشاعرے کے اسٹیج کی طرف متوجہ کر رہی تھی، حوصلہ دے رہی تھی اس لئے اور کہ Celebrity کون نہیں بننا چاہتا جو شاعری کے علاوہ کسی اور صنف ادب کے مقدر میں ہے ہی نہیں۔ عوامی مقبولیت، پسندیدگی کسے پسند نہیں۔ بڑے کل ہند مشاعروں میں بشیر بدر کے سفر کا آغاز تھوڑی ناکامی سے ہوا۔ میرٹھ کا کل ہند مشاعرہ تھا۔ ایک انکم ٹیکس آفیسر مسٹر بی ایس گاندھی کنوینر تھے۔ ہر مشاعرے سے پہلے مجھ پر بھروسہ کرتے ہوئے نئے شعراء کے نام پوچھتے۔ غالباً ۱۹۷۱ء کی بات ہے۔ میں نے بشیر بدر کا نام سجھایا، مدعو ہوئے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر میرے کرم فرما تھے۔ گزارش کی، نظامت کرتے وقت خاص خیال رکھیں۔ پہلی بار بڑے مشاعرے میں شریک ہو رہے ہیں بشیر بدر۔ بہت اچھے شاعر ہیں۔ خوبصورت پڑھتے ہیں۔ بشیر بدر اچھے تعارفی جملوں کے ساتھ مائیک پر بلائے گئے مگر سامعین کی نبض نہیں پکڑ پائے۔ 'بابا' ردیف والی غزل مسحور کن ترنم سے پڑھنا شروع کی، راس نہ آیا، تیسرے ہی شعر پر معاملہ ہاتھوں سے نکل گیا، بہت نروس ہوئے۔ میں نے سمجھایا، مایوس نہ ہو، ایسا ہو جاتا ہے۔ اگلا مشاعرہ بیاد غالبؔ بریلی میں تھا جس کے کنوینر اس وقت کے ڈسٹک جج فیاض حسین شاہ تھے۔ میں ان کا مشیر، بشیر بدر مدعو ہوئے، آئے، پڑھا مگر بات یہاں بھی نہیں بن سکی۔ کافی دکھی ہوئے۔ پھر سمجھایا، اللہ پہ بھروسہ رکھو، تمہارے پاس شاعری ہے، پڑھتے وقت خود اعتمادی ضروری ہے، بس اتنا ہی خیال رہے۔

۱۹۷۲ء کی بات ہے۔ لکھنؤ آل انڈیا ریڈیو پر ایک اردو پروگرام چلتا تھا' کلام شاعر بزبان شاعر' میں شرکت کرنے گیا تو اردو کے پروڈیوسر بلاغت رضوی یعنی شہاب سرمدی صاحب نوک پلک کے درست، نہایت ہی نستعلیق، بڑے پڑھے لکھے، منفرد سے انسان مگر مجھ سے متاثر مجھ پر بڑے مہربان، بولے، پروگرام ریکارڈ کرا لو تو کمرے پہ چائے پینے آنا۔ خوشخبری ہے تمہارے لئے۔ شاہجہاں بانو یاد بھی موجود تھیں، ریکارڈنگ کے بعد آیا تو کہنے لگے، مبارک ہو۔ تم اس بار لکھنؤ ریڈیو کے کل ہند مشاعرے میں مدعو ہو۔ سن کر دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا مگر ضبط کیا۔ اس زمانے میں ریڈیو کے مشاعرے میں مدعو ہونا کسی بھی شاعر کے لئے اولمپک گولڈ مڈل جیت لینے جیسا تھا۔ ایسا لگا:

'کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے'

بہر حال، شکریہ ادا کیا۔ ساتھ ہی گزارش بھی کر دی کہ محترم! بہت اچھے شاعر ہیں، بشیر بدر، علی گڑھ میں رہتے ہیں۔ اگر ممکن ہو تو غور فرمالیں۔ معنی خیز انداز میں مسکرائے، بولے پتہ لکھ جاؤ دیکھتا ہوں۔ اس وقت تو ان کی مسکراہٹ کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا مگر پھر سوچا تو سمجھا، سوچ رہے ہوں گے، کیا احمق انسان ہے! خود پہلی بار ریڈیو کے مشاعرے میں مدعو ہونے والے کی ہمت تو دیکھئے، سفارش بھی کر رہا ہے۔ بہر حال بشیر بدر ریڈیو کے اس کل ہند مشاعرے میں مدعو ہوئے۔ مخصوص اور منتخب سامعین سے کھچا کھچ بھرے آڈیٹوریم میں بشیر بدر نے شاید زندگی کا سب سے کامیاب مشاعرہ پڑھا ہو۔ کیا دلوں کو چھو جانے والا ترنم تھا۔ کیا غزل کا تاثر تھا، مطلع تھا۔

اپنی کھوئی ہوئی جنتیں پا گئے، زیست کے راستے بھولتے بھولتے
موت کی وادیوں میں کہیں کھو گئے، تیری آواز کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے

اس شعر تک پہنچتے پہنچتے ہال بے حال ہو گیا۔

آنکھیں آنسو بھری، پلکیں بوجھل گھنی، جیسے جھیلیں بھی ہوں، نرم سائے بھی ہوں
وہ تو کہئے انہیں کچھ ہنسی آ گئی بچ گئے آج ہم ڈوبتے ڈوبتے

بشیر بدر کی شاعری کا یہ کامیاب ترین لمحۂ پذیرائی تھا۔ شہرتوں کا ایسا بھرپور آغاز کم ہی شعراء کے حصے میں آتا ہے۔ یہاں سے جیسے ان کی موقع شناس ذہانتوں کے حق میں فضا ہموار ہوتی گئی۔ فتح مندی قدم چومنے لگی اور وہ مشاعروں کی ضرورت سے مجبوری بنتے گئے۔ ایک دور ایسا بھی آیا جب بشیر بدر اور وسیم بریلوی کے بغیر بڑے اور کامیاب مشاعرے کا تصور ہی محال سمجھا جانے لگا۔ یہ واقعات اس لئے ضبط تحریر میں لائے گئے کہ حقیقت بیان نہ کرنا بھی تحریری بددیانتی کے زمرے میں آتا ہے ورنہ خدا شاہد ہے، خود نمائی یا خودستائی میرے مزاج کا حصہ نہیں۔ نہ کسی کے قد کو کم کرنا میری منشاء ہے۔ میں تو صرف بتانا چاہتا تھا کہ کوئی مقام حاصل کرنے کیلئے کیسے کیسے مشکل مقامات سے گزرنا پڑتا ہے۔ بقول بشیر بدر:

یہ پھول مجھے کوئی وراثت میں ملے ہیں
تم نے مرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا

چلئے، یہ تو مشاعروں کی بات ہوئی مگر سچ یہ ہے کہ بشیر بدر اپنی پہچان رسائل میں پہلے ہی بنا چکے تھے۔ یہ پہچان انہیں، انہیں دنوں ملنے لگی تھی جب وہ فراقؔ گورکھپوری کے سکریٹری کے طور پر کارگزار تھے اور ہندو پاک کے موقر رسائل کے مدیران کے رابطہ میں رہے مگر بشیر بدر ہمیشہ کچھ الگ سا کرنے کی فکر میں بھی کم سرگرداں نہیں رہے۔ انہوں نے لفظی سطح پر بھی غزل کے مروجہ اسالیب سے چھیڑ چھاڑ کی اور موضوعاتی سطح پر بھی بدعتی جسارتیں دکھائیں مگر غزل کی غنائی سرمستی ان کے تخلیقی وجود کا بہر حال حصہ بنی رہی۔ پھولوں سے محو گفتگو ہونے، رنگوں سے ان کی زبان میں باتیں کرنے، خوشبوؤں سے اڑنے، چاند سے پینگ بڑھانے اور چاندنی سے کھل کھیلنے کی چاہ میں ان کی جمالیاتی حس نے وہ اسلوب پا لیا جو تاثیر و تاثر کے نئے باب وا کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر ساتھ ہی دردمندی کی زیریں لہر بھی چلتی ہے جو بار بار قاری کے درِ احساس تک دستک دیتی رہتی اور دور تک ہانٹ کرتی۔

علی گڑھ کے قیام کے دوران جدید اردو غزل

کے موضوع پر مقالہ لکھتے وقت انہوں نے غزل کے فکری واسلوبی اتار چڑھاؤ کا جس تندہی وانہماک سے مطالعہ کیا اور ہر دور کی غزل کے تغیراتی موسموں کو محسوس کیا اس نے وہ شعری زمین ضرور تیار کر دی جو آسمان پر کمندیں ڈال سکے۔ خود کو الگ ثابت کرنے اور منوانے کے لئے غزل میں نئی امیجری کے ذریعہ نئے امکان تلاش کرنے کی تڑپ جنون کی حد تک جا پہنچی۔ چنانچہ لفظی بدعنوانیوں کے کھیل کے ساتھ اخلاقی ضابطوں کو بھی بالائے طاق رکھ دینے کے عمل سے انہوں نے گریز نہیں کیا لیکن ان سب کے باوجود غزل ان کا پہلا اور آخر عشق ہی رہی جو انہیں بہرحال سنبھال لیتی ہے، اور وہ ادھر ادھر بھٹکنے کے باوجود خود سے مخاطبت کے لئے بیٹھ کے سستاتے، تو غزل ہی کی نرم گرم بانہوں میں پناہ لیتے۔ جنسی لذتوں کے بوجھ ان بوجھ ذائقے ہوں، جذباتی محرومیوں کے جانے انجانے گوشے ہوں، احساس کم مائیگی کے بے بس رویئے ہوں، سماجی ناہمواریوں کے دبے دبے شکوے ہوں، انسانی رشتوں کی بے حسی کے غم ہوں کہ قدروں کی پائمالی کے دکھ، ان کی غزلوں میں آتے ہیں، مگر آتے انہیں کی شرطوں پر ہیں۔ یعنی غزلیہ آہنگ سے اجازت لے کر۔ یہی بشیر بدر کی بشیر بدریت ہے جو انہیں اپنے عہد کی آوازوں میں متمایز کرتی ہے۔ ندا فاضلی، محمد علوی، شہریار، مظفر حنفی، بانی، احمد فراز، حسن نعیم کے دور میں بشیر بدر اپنی بیانیہ دل آویزی اور فکر انگریز موضوعاتی طرحداریوں کی وجہ سے الگ نظر آتے ہیں۔ ان کی شخصیت اور فن کے تضادات نے انہیں ہمیشہ موضوع گفتگو بنائے رکھا۔ یہ انکی حکمت عملی بھی ہوسکتی ہے مگر یہ بھی سچائی ہے کہ عوامی عدالت سے سرخرو ہونے کے بعد انہوں نے بند کمروں میں بیٹھ کر سورج کی نبض حرارت ٹٹولنے، پرکھنے اور اس پر فیصلے صادر فرمانے والوں سے اتنا ہی کہہ کر پیچھا چھڑا لیا:

کاغذ میں دب کے مر گئے کیڑے کتاب کے
دیوانہ بے پڑھے لکھے مشہور ہو گیا

کسی کا ایک شعر زباں زد خاص و عام ہو جائے اور کسی لسانی سماج کے ہونٹوں کی زینت بن جائے تو وہ ادب کی تاریخ میں رام نرائن موزوں ہو جاتا ہے، پھر بشیر بدر کے تو درجنوں اشعار ضرب المثل ہیں، عوام وخواص کے حافظے کا حصہ بن چکے ہیں، ایوان سیاست سے لے کر گلی گلیارے تک پڑھے اور بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ کیا یہ کم ہے انہیں ہمیشہ زندہ رکھنے کو۔

کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی
یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پاکستان میں کسی موقع پر کسی اخبار نویس نے بشیر بدر سے سوال کیا تھا، احمد فراز کا یہ شعر؛

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

اور آپ کا یہ شعر

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

یہ دو شعر اس دور میں بہت مشہور ہوئے۔ کیا کہیں گے آپ اس بارے میں؟

بشیر بدر نے معنی خیز شرارت کے ساتھ مگر سوچی سمجھی تفاخری عادت کے تحت جواب دیا تھا:

پہلا شعر گایا اچھا گیا ہے دوسرا شعر کہا اچھا گیا ہے۔

اپنے سامنے کسی کو کچھ نہ سمجھنا اور ہر بات اور ہر جملے میں خود نمائی کا پہلو نکالنے اور برتر ثابت کرنے کی کوشش ان کی ایسی کمی تھی جسے وہ کبھی دور نہیں کر سکے اور ان کی اس عادت نے انکی جائز شہرتوں کو بھی ناجائز حدوں تک جا پہنچایا۔ نتیجتاً انہوں نے دوستوں سے کہیں زیادہ دشمن بنائے۔ کبھی کبھی بے تکلف ماحول میں کسی بات پر ان کو میں ٹوکتا یا کہتا، یار! یہ کیا کر رہے ہو؟ تو کہتے، تم کیا جانو، ..... یعنی بے وقوف ہو۔ میں دنیا جان گیا ہوں۔ مجھے اب یہ تک معلوم ہے کہ نوبل پرائز کیسے حاصل کیا جاتا ہے۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہ جاتا۔

دھن کے پکے، لگن کے سچے، وقت شناس، موقع شناس، معاملہ شناس جس دن سے چلے، اپنی منزل پر نظر رکھنے والے بشیر بدر نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور کامیابیوں پر اپنی گرفت مضبوط کرتے گئے۔ شہرت کی راہ میں جو بھی آیا وہ ان کا دشمن تھا۔ مگر یہ موقع ان کی شخصیت پر بات کرنے کا ہرگز نہیں۔ اس وقت تو بات شاعر بشیر بدر کی ہے جو سر سے پا تلک شاعر، عام ڈگر سے بچ کے چلنے کا خوگر اور جس کی یہی ادا اسے ان بلندیوں تک لے گئی جس کی کوئی بھی فنکار تمنا کرتا ہے مگر سب کے مقدر میں یہ انمول فتح مندیاں کہاں۔

بشیر بدر کی غزل اس نمناک غنائیت کی سبک روی کا نام ہے جسے کوئی شعری عہد اپنے سفر کا عنوان بنانے میں فخر محسوس کرے گا۔ ذاتی اور سماجی زندگی سے ہٹ کر صرف اور صرف شاعری کے آئینے میں انہیں دیکھئے تو ان کے ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔ انہوں نے لفظ کی بیانیہ طاقت کی انتہاؤں کو حساس فکر کی انگلیوں سے کچھ ایسے چھوا اور ایسی شعری فضا بنائی کہ بشیر بدر کا گھور مخالف بھی دانتوں میں انگشت اعتراف دبائے بغیر نہیں رہتا۔ خدا انہیں صحت دے، طاقت دے، ہمت دے کہ وہ پھر اٹھ کھڑے ہوں اور دنیا کہتی رہ جائے،

'ایسا کبھی ہوتے ہوئے ہم نے نہیں دیکھا'

بشیر بدر سے برسوں کا تعلق ہے۔ اسی تعلق کو سلام کرتے ہوئے اپنا یہ شعر پیش کر کے گفتگو ختم کرتا ہوں:

ہمارے بارے میں لکھنا تو بس یہی لکھنا
کہاں کی شمعیں ہیں کن محفلوں میں جلتی ہیں

❑❑❑

ہم نے عام آدمی کی زبان کو قبول ہی نہیں کیا

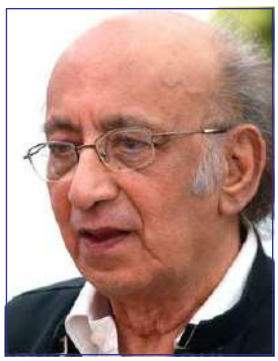

۲۰۱۴ء میں ہندوستانی فلموں کے سو سال مکمل ہونے پر ہندی اور اردو زبان کے مسائل اور پیچیدگیوں پر سہیل وحید اور ندا فاضلی کی گفتگو کے اقتباسات

کیا وجہ ہے کہ اردو کے مصنف اور شاعر ہندی فلموں میں خوشی سے کام کرتے ہیں۔ گانے، ڈائیلاگ اور باقی سب بھی اردو میں لیکن فلم ہندی میں، جب کہ کنڑ، ملیالم، بنگالی یا تیلگو زبانوں کے مصنفین کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔

اردو ہندی کا معاملہ بڑا دلچسپ ہے۔ دونوں زبانوں کا علاقہ ایک ہے، ایک ہی حلقہ میں پیدا ہوئیں اور پروان چڑھیں اور پوری دنیا میں شاید ہی کہیں ایسی دو زبانیں ہوں جو تقریر میں ایک ہوں اور تحریر میں دو تو ان دونوں کی جو خاصیت ہے وہی مسئلہ بن گئی۔ ۱۴ویں صدی کے عظیم صوفی شاعر امیر خسرو نے لکھا ہے:

خسرو رین سہاگ کی جاگی پی کے سنگ
تن میرا من پیو کا دوؤ بھئے یک رنگ

یہ کیا ہے، ہندی یا اردو۔ ظاہر ہے امیر خسرو کے زمانے میں تو ہندی اردو کا جھگڑا بھی نہیں تھا۔ دراصل اردو کے ساتھ سیاست ہوگئی۔ اسے مسلمانوں کی زبان کے طور پر زبردستی پروجیکٹ کیا گیا جب کہ سب جانتے ہیں کہ بنگالی مسلمان بنگالی بولتا ہے، یہی حال گجراتی مسلمانوں کا ہے، ان کی زبان بھی اردو نہیں ہے۔ اس سیاست کا اثر ہر طرف نظر آتا ہے تو فلم انڈسٹری اس سے اچھوتی کیسے رہ سکتی ہے۔

لیکن اردو کی فلموں کو بھی سینسر بورڈ سے ہندی فلم کا ہی سرٹیفکٹ ملتا ہے، اس کے خلاف بہت زیادہ آواز بھی نہیں اٹھتی۔

دیکھیے، سینسر بورڈ بھی پرو ہندی ہے، ہندی کی حمایت کرتا ہے اور اردو کے لئے جو لڑتا ہے وہ فرقہ پرست کہلاتا ہے۔ ایسے ماحول میں کیا ہوسکتا ہے جہاں گانے اردو میں، ڈائیلاگ اردو میں، فلم کا ڈھانچہ یعنی اسکرپٹ اردو میں جو بات چیت ہو رہی ہے، جو کچھ دکھایا جا رہا ہے یعنی اسکرین پلے تک اردو میں ہوتا ہے اور یہ سب جس فلم میں ہوتا ہے اسے ہندی فلم کہا جاتا ہے، اسے ٹائٹل ہندی کا دیا جاتا ہے۔ ارے غالب نے بھی اپنی شاعری کو 'کلام ہندی' کہا تھا یعنی ہندوستان کی شاعری تو ان کی شاعری ہندی کی تو ہو نہیں گئی۔

بات یہ ہے کہ مولوی جو بولتا ہے، اسے اردو کہا جاتا ہے اور جو پنڈت بولتا ہے، اسے ہندی۔ ہم نے عام آدمی کی زبان کو قبول ہی نہیں کیا۔ سماج کے پُراثر طبقہ کی زبان یہی دو زبانیں رہی ہیں۔ اسی لئے ان دونوں پر سیاست ہوتی رہی ہے۔

کیا اس کی وجہ فلموں میں ملنے والی کثیر رقم ہے کہ اردو کے فلموں سے متعلق مصنف اور شاعر اس معاملے پر چوں تک نہیں کرتے۔

ان کے اختیار میں کچھ ہے ہی نہیں۔ مصنف اور شاعر شاہے وہ کسی بھی زبان کے ہوں، فلم انڈسٹری میں بہت معمولی حیثیت کے آدمی ہیں۔ چلتی تو پروڈیوسر اور ڈائرکٹر کی ہے۔

گلزار اردو کے شاعر و ادیب ہیں لیکن ان کی فلمیں ہندی کی ہوتی ہیں۔ ساحر لدھانیوی نے اردو کے اس مسئلے کو اٹھایا تھا لیکن حاصل کچھ نہیں ہوا کیونکہ فلم انڈسٹری کا اپنا الگ معاملہ ہے جیسے ہر انڈسٹری میں ہوتا ہے۔

کیا اس مسئلے کا کوئی حل آپ کو نظر آتا ہے؟

جگجیت سنگھ جب غالبؔ کی غزل گاتے ہیں تو سامعین کیا اردو والے ہی ہوتے ہیں۔ اردو کی کتابیں جب ہندی رسم الخط میں چھپتی ہیں تو ان کی قیمت بہت زیادہ ہوتی ہے اور وہ فروخت بھی خوب ہوتی ہیں۔ اس وقت کہاں رہ جاتا ہے اردو ہندی کا فرق۔ میں نے شعر کہا، 'کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا' اب یہ اردو ہے یا ہندی؟ فلم انڈسٹری میں اسی طرح چل رہا ہے سب۔

کیا آپ مانتے ہیں کہ ہندی فلم انڈسٹری مصنفین اور شعراء کے پناہ گاہ کے طور پر بہت بڑا کردار ادا کر رہی ہے؟

مصنفین کے سامنے راہ ہی کون سی ہے، وہ کہاں جائیں۔ یہاں لکھنے پڑھنے کا کام مسلسل ہوتا ہے، معاوضہ ملتا ہے اور دوسری جگہوں سے زیادہ ملتا ہے تو ظاہر ہے کہ لکھنے والے لوگ اس سے وابستہ ہوں گے اور اب اسے پناہ گاہ کہا جائے تو غلط تو نہیں ہے۔

اردو کے مصنفین کچھ زیادہ ہی وابستہ ہو گئے ہیں۔ یہ اتفاق ہے یا ضرورت؟

دیکھئے ہے تو ضرورت، کیونکہ اردو ہی عام آدمی کی زبان ہے۔ اب جہاں تک بات اردو ادیبوں کی فلموں سے وابستگی کی ہے تو ۱۹۵۲ء میں جب ترقی پسند مصنفین پر مصیبت کے بادل چھائے تو سب ممبئی میں جمع ہو گئے۔ راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، جاں نثار اختر، مجروح سلطانپوری، علی سردار جعفری اور دیگر تمام لوگ بھی اکٹھا ہو کر اور فلم انڈسٹری میں شامل ہو گئے۔ سب نے کام بھی بہت اچھا کیا تو سب اپنی اپنی جگہ جم گئے۔

تب ہندی کے مصنفین کیوں نہیں آئے فلم انڈسٹری میں جس وقت اردو کے مصنفین انڈسٹری میں شامل ہوئے؟

دیکھئے، یہ معاملہ بھی پرانا ہے۔ پریم چند کو آخر کیوں اردو سے ہندی میں لکھنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اردو والوں کے پاس تو کوئی دوسرا راستہ ہی نہیں تھا۔ ہندی والوں کو تو ہندی ناشرین بھی روپئے دیتے ہیں۔ میگزینیں بھی معاوضہ دیتی ہیں جب کہ اردو کی میگزینیں ایک بھی پیسہ نہیں دیتیں۔ ایسے میں دوسرا راستہ کون سا بچتا ہے۔

تو کیا فلم انڈسٹری سے ملنے والی کثیر رقم نے اردو مصنفین کو مختلف طرح کے سمجھوتے کرنے پر مجبور کیا؟

سمجھوتے کہاں نہیں ہو رہے ہیں۔ کیا یونیورسٹی، کالج میں نہیں ہو رہے ہیں۔ کس حکومت پر بدعنوانی کے الزامات نہیں لگائے جا رہے ہیں۔ کس کو دودھ کا دھلا کہیں گے آپ۔ جس سسٹم میں زندگی گزار رہے ہیں، اسے شاید بدلا نہیں جا سکتا۔ آخر مصنفین ہی پر کیوں سمجھوتہ کرنے کا الزام عائد کیا جاتا ہے جب کہ فلم انڈسٹری میں سب سے ابتر جگہ مصنف کی ہے۔

یہاں شاستری نگر میں قبرستان ہے جہاں مدھوبالا بھی دفن ہیں اور محمد رفیع بھی۔ اسی جگہ پر پرانے زمانے کے سب سے مشہور شاعر ساحر لدھانیوی کی قبر بھی تھی۔ محمد رفیع کی قبر گرینائٹ کی ہے تو وہ بچی رہ گئی اور ساحر کی قبر کا پتہ بھی نہیں چلا کہ کہاں گئی۔ اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ کس کی کیا اہمیت ہے۔

آپ مانتے ہیں کہ اگر فلم انڈسٹری نہ ہوتی تو کوئی مصنف اور شاعر کروڑ پتی نہیں بن سکتا؟

دیکھئے، جو سب سے زیادہ لکھتا ہے یا فلموں میں رائٹنگ کا کام کرتا ہے وہ اتنی زیادہ رقم کماتا ہے۔ اردو کے مصنفین میں گلزار اور جاوید اختر کو سب سے زیادہ رائلٹی ملتی ہے۔ ان سے پہلے ساحر لدھانوی، شکیل بدایونی، شیلیندر جیسے نغمہ نگاروں نے بھی کافی کمایا تھا۔ یہ تو صحیح ہے کہ فلم انڈسٹری نے قلمکاروں کو کافی پیسہ دیا۔

فلم انڈسٹری میں کوئی قابل ذکر تبدیلی؟

الفاظ کی ختم ہوتی اہمیت۔ سب سے زیادہ مایوسی اسی سے ہے۔ اب اے آر رحمان کو ہی لے لیجئے۔ انہیں نہ ہندی آتی ہے نہ اردو، بیٹس ساؤنڈ چل رہا ہے۔ بازار حاوی ہو گیا ہے۔ یہ کیا ہے؟

❑❑❑

ندا فاضلی کی زندگی کے کچھ شنیدہ اور ناشنیدہ پہلو

دہلی میں ندا کی ایک خالہ رہتی ہیں۔ کٹرہ مہر پرور میں ان کا بڑا سا دو منزلہ مکان ہے۔ وہ سیدھا وہیں جاتا ہے۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ناشتے تک پورے خاندان کی تاریخ دہرائی جاتی ہے۔ ان کو اپنی بہن کے دکھوں اور بہنوں کے مظالم کی یاد آتی ہے۔ ایک ایک کر کے جمیل فاطمہ اور مرتضیٰ حسن کی بے جوڑ شادی سے لے کر ندا کے پاکستان نہ جانے تک کے سارے واقعات یاد کئے جاتے ہیں۔ بھیگی ہوئی آنکھوں سے وہ پہلے جمیل فاطمہ کے دکھوں کو سیراب کرتی ہیں اور بعد میں اس کے آرام کے لئے ایک کمرہ کھول دیتی ہیں۔ شروع میں مہمان کی طرح خوب آؤ بھگت ہوتی ہے لیکن جب مہمان نئے سے پرانا ہوتا ہے تو میزبانی مہربانی میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔ ان کا رویہ بدلنے لگتا ہے۔ ایک دن وہ 'جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب' کی سیاحی کر کے لوٹتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سامان قریب کی ایک مسجد کے حجرے میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ مسجد میں رہنے کے اپنے آداب ہوتے ہیں۔ ان آداب میں سحر خیزی ضروری شرط ہے۔ رات کو دیر سے آنے کی طرح چار پانچ بجے جاگ کر مجبوراً سر بہ سجدہ ہونا روز کا معمول ہے۔ کبھی اتفاق سے جلدی آنا ہوا تو عشاء کی نماز کے بعد مسجد کے امام کا وظیفہ پورا ہونے تک یا خدا میں دوزانو بیٹھنا پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں جب تھکن نیند بن کر آنکھوں سے جھانکتی ہے تو امام کے وظیفے کی آواز کوسوں دور ہو جاتی ہے یوں تو وہ وظیفہ ختم ہوتے ہی اپنے گھر چلے جاتے ہیں لیکن جب کبھی بڑھاپا گھر کا فاصلہ بڑھا دیتا ہے تو مسجد میں ہی رہ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں نوجوانوں کی بے راہ روی اور اسلام کے فیوض پر ان کا دیر تک وعظ فرمانا ضروری ہے۔ ان بابرکت کلمات سے اپنی عاقبت سنوارنا سننے والے کی مجبوری ہے۔ مسجد کا حجرہ وضو کے حوض کے قریب ہے۔ حجرے کی دیوار کے ساتھ وہ لمبا سا تختہ لٹکا ہے جس پر لٹا کر محلے کے مرحومین کو آخری غسل دیا جاتا ہے۔ یہ تختہ دیگر متعلقہ چیزوں کی طرح مسجد کی ملکیت بھی ہے اور آمدنی کا ذریعہ بھی۔ یہ تختہ ہفتے میں ایک دو بار اجرتاً باہر جاتا ہے اور اپنا فرض پورا کر کے خود بھی نہا دھو کر اپنی جگہ آ کر ٹک جاتا ہے اور مرنے والے کے غم میں دیر تک بوند بوند آنسو ٹپکا تا رہتا ہے۔ اس کی جھریوں سے ٹپکتے ہوئے آنسوؤں نے بنا کھڑکی اور روشن دان کے نیم تاریک کمرے کی فضا کو ہی غمناک نہیں بنایا ہے، اس روز روز کے غم میں خود بھی کالا اور کھردرا ہو گیا ہے۔

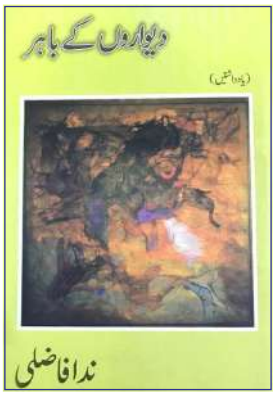

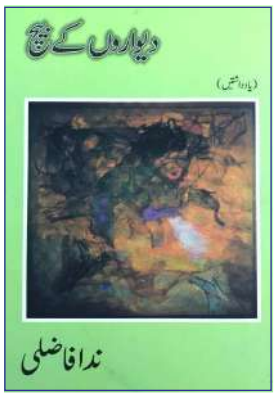

سلام مچھلی شہری آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہیں۔ ندا کی ان سے شناسائی گوالیار کے مشاعروں سے ہے۔ وہ ندا کی بے روزگاری پر ترس کھا کر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اس سے کلام شاعر کے پروگرام میں شعر پڑھواتے رہتے ہیں۔ شعر پڑھنے کا معاوضہ پچیس روپئے کا چیک ہوتا ہے جو ریڈیو کے سامنے کے بینک سے پانچ بجے سے پہلے ہی کیس ہوکر آجاتا ہے۔ ہر بار چیک کی رقم سے کناٹ پلیس میں ریگل کے پاس سے شراب کی بوتل خریدنا اور پھر ٹیکسی میں انہیں گھر تک پہنچانا ندا پر واجب ہے۔

ہر ریڈیو پروگرام کی یہ وہ شرائط ہیں جو گورنمنٹ کنٹریکٹ فارم میں ہر بار درج کرنا بھول جاتی ہے۔ سلام کو ہی انہیں بار بار دہرانا پڑتا ہے اور ضرورمندوں کو خاموشی سے انہیں نبھانا پڑتا ہے۔ سرکار کی اس قسم کی غلطیوں کو سدھارنا وہ اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ان کی شراب نوشی ان دنوں عروج پر ہے۔ اس میدان میں دہلی میں ایک نریش کمار شاد ہی ان کے حریف ہیں۔ سماج سے دونوں کی لڑائی کی شدت تو ایک سی ہی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ شاد افسران کی قدر افزائی کے کارن دن میں بھی رات کا چاند بنے رہتے ہیں اور سلام پیشہ ورانہ مجبوریوں کے تحت سورج اور چاند کو الگ الگ ناموں سے پکارتے ہیں۔ صرف مشاعروں ہی میں وہ نظام قدرت کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں۔ عام طور سے ان کی ہر رات دیر تک جاگتی ہے۔ رات کا خمار سارے دن ان کی دفتری ذمہ داریوں سے الجھتا رہتا ہے جسے ٹالنے کے لئے وہ لگاتار چار مینار کا کڑوا دھواں اپنے اندر اتارتے رہتے ہیں اور جب دیکھو سونے اور جاگنے کی کشمکش میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ ان کی محدود آمدنی میں ان کی مدہوشیوں کے لئے گنجائشیں ممکن نہیں ہیں۔

اپنے گھر کے تعلق سے وہ نہایت ہی ذمہ دار انسان ہیں۔ ملازمت سے جو کماتے ہیں اس کا بیوی بچوں کو حقدار بناتے ہیں، اپنے شوق کے لئے دوسرے ذرائع اپناتے ہیں۔ ان کی اس ہوش مندی نے انہیں بھلے ہی منتشر کیا ہو لیکن گھر کو بکھرنے سے محفوظ رکھا ہے۔ ان دوسرے ذرائع میں مقامی و بیرونی مشاعرے، ریڈیو کنٹریکٹ کی زبانی شرائط، عوامی رسائل میں فرمائشی شاعری، سب شامل ہیں۔ روز کی یہ تگ و دو انہیں ہمیشہ سوسائٹی کے کیپٹلسٹ نظام کا ناقد بنائے ہوئے ہے۔ سماج میں فنکار کی ناقدری دن بھر ان کی گفتگو کا موضوع رہتا ہے۔ سماج کی یہی ناانصافی انہیں انتقاماً زیادہ پینے اور خیالی محبوباؤں اور تصوراتی دنیاؤں کی تخلیق پر مجبور کرتی ہے۔ ان دنیاؤں کے وہ ہیرو ہوتے ہیں۔ جن کے آگے پیچھے ہمیشہ سجے بنے بنگلوں کی تعلیم یافتہ خوبصورت لڑکیوں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ یہ لڑکیاں جو عمر میں کبھی ان سے آدھی اور کبھی تین چوتھائی سے زیادہ نہیں ہوتیں، شاعر کو اپنا آئیڈیل بنا کر اپنی حسین تنہائیوں کو آباد کرتی ہیں۔

مشاعرے کے اسٹیج اور رسائل کے صفحات کے ذریعہ وہ ان کے نام منظوم خطوط بھی پوسٹ کرتے ہیں۔ ان کے جوابات بھی خود منظوم کر کے ان کی طرف سے اپنے نام ارسال کرتے ہیں یا اسٹیج سے سناتے ہیں۔ اسٹیج پر وہ شعر کم سناتے ہیں، تماشا زیادہ دکھاتے ہیں۔ ہاتھ میں سلگتی چار مینار، کندھے پر انٹلیکچوئل بیگم، سر کہیں، پاؤں کہیں کے عالم میں مائیک کے سامنے آتے ہیں۔ نئی نظم کے دھوکے میں ایک بار گھر کے سامان کی فہرست ان کی قیمتوں کے ساتھ دہرانے لگے۔ سننے والے کریم، ساڑی کا فال، گھی، ہیر پن، پاؤڈر اور ایسی ہی دوسری اشیاء کے ناموں کو بھی ان کی جدت اظہار سمجھ کر داد سے نوازتے رہے۔ سامعین سے سوال و جواب ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ نظم پڑھتے پڑھتے کسی لفظ پر اچانک رک جاتے ہیں۔ جیسے نظم میں یہ مصرع آیا:

'بار بار آئینے کے سامنے جایا نہ کرو'

سامعین نظم کے آگے بڑھنے کے منتظر ہیں مگر نظم آگے نہیں بڑھتی۔ سامعین اور شاعر کے درمیان صرف ایک لفظ 'آئینہ' ٹنگا ہوا ہے جسے بار بار نئے نئے انداز سے ادا کیا جارہا ہے اور پھر یوں ہوتا ہے کہ ایک بار وہ آئینہ کہتے ہیں اور اس کے جواب میں پورا ہال کورس میں آئینہ بولتا ہے۔ یہ تکرار جب زیادہ بڑھتی ہے تو وہ یکسانیت سے اوب کر سامعین سے مکالمہ شروع کر دیتے ہیں۔

'جانتے ہو آئینے کا مطلب کیا ہے؟'

'نہیں، آپ بتلائیں' ادھر سے دو چار آوازیں آتی ہیں۔

'میں شاعر ہوں، مزدور نہیں ہوں۔ میں شعر سناؤں گا اور مطلب تم۔۔۔'

'اب بتا بھی دو صاحب' بناوٹی لہجہ میں کوئی کہتا ہے۔

'آئینہ' جھنجھلا کر سلام کہتے ہیں۔

'آئینہ' سارے سننے والے ہنستے ہوئے دہراتے ہیں۔

اس طرح، اس دوطرفہ مکالمہ بازی سے سنجیدہ محفل قہقہہ بن جاتی ہے۔ ایسے وقت اگر کسی منتظم کی شامت آتی ہے تو وہ بے چارہ دخل اندازی کی ہمت کر بیٹھتا ہے اور سلام اور سامعین کے معاملے میں مداخلت کر کے اپنے حسب نسب کی رسوائی کا باعث بنتا ہے۔ سارا مشاعرہ اب سننے سے زیادہ دیکھنے کی چیز بن جاتا ہے۔ ان کے اصرار پر، ان کے بعد جس شاعر کو زحمت کلام دی جاتی ہے، وہ سلام کے بنائے ہوئے ماحول میں اپنے آپ کو اجنبی پاکر واپس لوٹ جاتا ہے۔ بار بار سلام کو بلا کر پڑھوایا جاتا ہے۔ دکھایا جاتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں جو چاہتے ہیں، پڑھتے ہیں، یا صرف کھڑے ہوکر مسکراتے ہیں۔ سننے والے ان کی ہر ادا پر داد کا شور مچاتے ہیں۔

مشاعرے کی صبح رات کی کامیابی کے صلے میں وہ معاوضے کی رقم میں کچھ اضافہ کا بھی مطالبہ کرتے ہیں۔ سلام کی دن بھر کی دبی گھٹی شخصیت ہر رات اسی طرح نشے کی سیڑھیوں سے عظمتوں کی بلندیوں پر پہنچ جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ اونچائیاں اتنی ہوتی ہیں کہ وہاں سے خود ان کے لئے اترنا مشکل ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر اس مشکل کو آسان کرنے کے لئے دوسروں کو بھی مدد کے لئے آنا پڑتا ہے اور انہیں باہر لے جا کر دو تین گھنٹوں کی نیند کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔

رات کی ہر بات وہ صبح بھول جاتے ہیں اس لئے پچھتاوے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

فرزانہ نشے میں ہے دیوانہ نشے میں ہے
جب میں نشے میں ہوں تو زمانہ نشے میں ہے

ان کی ہر رات کا ناز بردار کوئی نہ کوئی ہوتا ہے۔ اکثر تو ان کی شامیں باہر گزرتی ہیں لیکن جب گھر جانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوتا تو کسی نہ کسی کو ساتھ لے لیتے ہیں۔ یہ ساتھ کا آدمی دفتر سے ان کے ہمراہ کناٹ پلیس آتا ہے اور وہاں مہمان ہوتے ہوئے بھی میزبانی کا فرائض انجام دیتا ہے۔ ان فرائض کی ادائیگی میں شراب کے برانڈ سے لے کر دوسرے لوازمات تک خود ان کی پسند نت نئی دلیلوں کے ساتھ رہنمائی کرتی ہے۔ مختصر سی اس شاپنگ میں وہ فروٹس بھی تاکیداً شامل کرائے جاتے ہیں جو کسی شریف گھر میں کسی شریف مہمان کی پہلی آمد کی تہذیبی شرط ہے۔ سلام کا گھر یوپی کے نچلے متوسط طبقے کا نمائندہ گھر ہے۔ اس تہذیب کے ادب آداب ہر جگہ نمایاں ہیں۔ ہر چیز قرینے سے اپنی جگہ نظر آتی ہے۔ سلام کے بوہیمین مزاج سے یہاں کی فضا بالکل مختلف ہے۔ سلام کرتے ہوئے آتے جاتے بچے، دعائیں دیتی بزرگیاں، دھیمی آواز میں بولتا زنان خانہ، دیواروں کے رنگوں کے مطابق کھڑکیوں کے پردے، تکیوں پر نیند کے موضوعات پر کڑھے ہوئے اساتذہ کے اشعار، ایک کونے میں چمکتا ہوا خاصدان، میز پر سجا تازہ پھولوں کا گلدان، دیواروں پر لکڑی کی کھدے ہوئے اللہ اور دیگر بزرگان کے نام۔ ندا اس گھر میں پہلی بار آیا ہے۔ شراب شروع ہونے سے پہلے گھر کے چھوٹے بڑوں سے اس کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ اس کی خاطر مدارات کے لئے خانگی احکامات صادر فرمائے جاتے ہیں۔ فرمائش کر کے گھر والوں کے سامنے شعر سنے جاتے ہیں۔ پھر جیسے جیسے بوتل میں چاند نیچے اترنے لگتا ہے، سلام جذباتی ہوتے جاتے ہیں۔

اے ناقدان رندی و آوارگی معاف
جب جانوں میری طرح سے دو دن گزار لو

مچھلی شہر سے دہلی تک کے سفر میں ان کے ساتھ ان کے معاصرین اور حالات نے جو بدسلوکیاں کی ہیں وہ ایک ایک کر کے انہیں یاد آتی ہیں۔ ان گلہ مندیوں کے ساتھ وہ اپنے گھر والوں کی قربانیاں بھی دہراتے جاتے ہیں۔ شراب کو گناہ ٹھہراتے ہیں لیکن پیگ کے بعد پیگ بنائے جاتے ہیں۔ نشہ جب زیادہ ہو جاتا ہے تو وہ رونے اور مسکرانے کی درمیانی کیفیت میں آجاتے ہیں۔ اس کیفیت میں وہ اچانک اپنی لڑکیوں کی بڑھتی ہوئی عمروں سے باخبر ہو جاتے ہیں اور ایک نوجوان مہمان کے ساتھ گھر میں شراب پینے کی غلطی انہیں پریشان کرتی ہے۔ اس غیر تہذیبی عمل کا سارا قصور مہمان کا ہوتا ہے۔ اس قصور کی سزا اسے یوں دی جاتی ہے کہ اندر سے آتا ہوا کھانا واپس کر دیا جاتا ہے۔ ان کی آواز کا والیوم آپ ہی آپ بڑھ جاتا ہے اور مہمان کا ایسے ماحول میں زیادہ بیٹھنا محال ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی آبرو کی خاطر زیادہ بے آبرو نہ ہونے کے ڈر سے واپس لوٹ آتا ہے۔ کس لئے آئے تھے اور کیا کر چلے۔

●

رات کو وہ دیر سے مہرولی سے دریا گنج کے لئے ایک بس میں سوار ہوتا ہے۔ بس میں ٹکٹ لیتے وقت اچانک اس کی نظر اپنی انگلی پر پڑتی ہے۔ انگوٹھی کی جگہ پر اب انگلی راس کا نشان ہی دکھائی دیتا ہے۔ کئی مہینوں کا نشان ہے، جلد کے اس نشان کو ختم کرنے میں کئی دن لگیں گے۔ بس میں کافی بھیڑ ہے۔ اسے اپنی سیٹ کے قریب ایک جانا پہچانا چہرہ نظر آتا ہے۔ اب سے پہلے بھی وہ رات کے وقت الگ الگ جگہوں پر مل چکا ہے۔ اس کا نام رام سرن ہے۔ وہ بلند شہر کی کسی بستی سے یہاں آکر پوسٹ آفس میں چپراسی ہوا ہے۔ گاؤں میں اس کی ایک بوڑھی ماں ہے، ایک بھائی ہے۔ باپ نے علاقہ کے ایک ڈاکو کو پکڑوانے میں پولیس کا ساتھ دیا اور اس کے گروہ نے ایک ہفتے کے اندر دن دہاڑے اس ایمانداری کا انتقام لیا۔ پولیس نے اس کے مرنے کے بعد مخبری کی رقم ہضم کر لی لیکن گروہ کے نئے سردار نے اس انتقام میں اپنی پرمپرا کو نہیں چھوڑا۔ گاؤں کے ساہوکار کے یہاں سے بیوہ اور اس کے دو بچوں کے لئے کئی مہینے تک پابندی سے اناج آتا رہا۔ بعد میں جے پرکاش نارائن کی 'ڈاکو سدھار' اسکیم کے تحت سچا نے جب اپنے ہتھیار سرکار کے حوالے کر دئے تو ساہوکار نے بھی بے خوف ہو کر اناج دینا بند کر دیا۔ چھوٹی عمر میں گھر کی ساری ذمہ داری رام سرن کے گھر آگئی۔ چھ جماعت کے بعد اسکول چھوڑ کر بچپن میں ہی اسے چھوٹی بڑی مزدوری میں جٹ جانا پڑا۔ اس کا باپ اسے پڑھا لکھا کر بڑا افسر بنانا چاہتا تھا لیکن قسمت نے چپراسی بنا دیا۔ وہ اپنی بد نصیبی کو اب اپنی محنت سے چھوٹے بھائی کی خوش نصیبی سے بدل رہا ہے۔ گاؤں میں اس کا بھائی اسکول جاتا ہے۔ دہلی سے ہر ماہ وہ خود روکھی سوکھی کھا کر جو کچھ بچاتا ہے، اسے ماں کے پتے پر گاؤں بھیج دیتا ہے۔ اسکول کی تعلیم ختم کر کے بھائی پھر شہر کے کالج میں

جاتا ہے۔ کالج کی تعلیم میں فیس اور کتابوں کے ساتھ ڈھنگ کے کپڑوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس بڑھتے ہوئے خرچے کو پورا کرنے کے لئے وہ آفس کے وقت کے بعد اسٹیشن پر قلی گیری بھی کرنے چلا جاتا ہے۔ رام سرن سیدھا سادہ گاؤں کا آدمی ہے۔ دوسروں کو اپنے دکھ سکھ میں شریک کرنے کے اس قصباتی سبھاؤ پر ابھی شہری مصلحتوں کی دھول نہیں چڑھی ہے۔ رام سرن کی باتیں سنتے سنتے ندا کی آنکھ لگ جاتی ہے۔ چاندنی چوک کے آخری اسٹاپ پر کنڈکٹر اسے جگاتا ہے۔ پوری بس میں وہ اکیلا ہوتا ہے۔ رام سرن جاچکا ہے اور اسی کے ساتھ ہی ندا کا فاؤنٹین پین اور جیب کے سارے پیسے بھی راستے میں کہیں پیچھے اتر چکے ہیں۔ وہ خالی جیب بس سے اترتا ہے۔ اسے یقین ہے رام سرن نے جس مقصد کو پورا کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے، اس میں وہ ضرور کامیاب ہوگا۔ شہر نے گاؤں کے آدمی کو کامیابی کا راستہ دکھایا ہے۔ وہ اپنی انگلی میں انگوٹھی کے نشان کو سہلاتا ہوا مسجد میں واپس آتا ہے۔ وہاں پاکستان سے آیا ہوا ایک خط اس کے انتظار میں ہے۔ وہ مٹی کی ڈبیا روشن کرکے اسے پڑھتا ہے۔ خط بڑی بہن نے لکھا ہے:

'تم جیسا پتھر دل شاید ہی کوئی ہو۔ صاحبہ کی بیماری کی اطلاع تمہیں پہلے دی گئی تھی، لیکن نہیں آئے۔ مرحومہ آخر وقت تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تمہیں تلاش کرتی رہیں۔ جب بھی بے ہوشی کے وقت ہوش کا وقفہ آتا تمہارا نام ان کی زبان پر ہوتا۔ جب تک وہ زندہ رہیں، تمہاری جدائی کے صدمہ کو جھیلتی رہیں، گھر کی ہر خوشی کو آنسوؤں سے بھگوتی رہیں۔ لیکن تم سے اتنا بھی نہ ہوسکا کہ وقت پر آکر مرحومہ سے انا دودھ بخشوا لیتے۔'

یہ خط گوالیار سے ری ڈائریکٹ ہوکر دہلی آیا ہے۔ خط پر دو ہفتے پہلے کی تاریخ ہے۔ پہلے کے خط شاید پوسٹ مین کی نظر میں ضروری نہیں تھے۔ وہ اس تک نہیں آئے۔ جمیل فاطمہ کے انتقال کی خبر سے اس کی آنکھیں تو نہیں بھیگتیں لیکن جب وہ چراغ بجھا کر سونے کی کوشش کرتا ہے تو آنکھیں پلک سے پلک جوڑ کر بھی نیند سے دور رہتی ہیں۔ وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے اور پھر اچانک باہر نکل کر وضو کرتا ہے اور بے وقت کی نماز پڑھنے کھڑا ہوجاتا ہے۔ مسجد میں قیام کے دوران یوں تو ہر صبح کی اذان اسے بستر سے اٹھنے پر مجبور کردیتی ہے لیکن آج وہ نہ صرف اذان کا ہی انتظار نہیں کرتا بلکہ خدا اور انسان کے درمیان پیش امام کی قیادت کو بھی ضروری نہیں سمجھتا۔ ایسی محویت اس پر نہ

اب سے پہلے طاری ہوئی تھی اور نہ بعد میں اس طرح محسوس ہوتی ہے۔ خدا آسمان سے اتر کر خوشبو کی طرح مسجد کے آنگن میں پھیل جاتا ہے۔ چاروں طرف اندھیرا روشن سا محسوس ہوتا ہے۔ ہوائیں پیڑوں سے اتر کر بے آواز ہوجاتی ہیں۔ خاموشی اور خاموش ہوکر خلا میں دو ساکت آنکھوں میں ڈھل جاتی ہے۔ ایک جنون کی سی کیفیت ندا کو اس کے وجودی حواس سے آزاد کرکے اس احساس میں تحلیل کرجاتی ہے جہاں غم اور خوشی کا فرق زائل ہوجاتا ہے اور وہ آج کی نماز میں آگے پیچھے کی ساری نمازوں کا کفارہ ادا کرتا ہے۔ مسجد میں چہل پہل ہوتے ہی خدا واپس آسمان کی وسعت بن جاتا ہے اور ندا حجرے میں آکر اپنے بکھرے ہوئے سامان کو صندوق میں رکھنے لگتا ہے۔ اس نے دہلی چھوڑنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ وہ یہاں سے کہاں جائے گا۔ یہ اس کے ذہن میں ابھی صاف نہیں ہے۔ صندوق میں پڑی وہ چاندی کی انگوٹھی، جو اس نے کچھ دن پہلے منحوس سمجھ کر اتار دی تھی، اسے دوبارہ پہن کر وہ اسٹیشن کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔ اسٹیشن پہنچ کر وہ بمبئی کا ٹکٹ لیتا ہے لیکن گوالیار کا اسٹیشن آتے ہی وہ بلا ارادہ وہاں اتر جاتا ہے۔ وہ وہاں سے سیدھا اس جگہ جاتا ہے جہاں اپنے ماں باپ کی قبروں کے درمیان زیبن مدفون ہے۔ وہ جمیل فاطمہ کے لئے اس کی لحد پر فاتحہ پڑھتا ہے۔ چہروں اور ناموں کے امتیازات زندگی کے واہمے ہیں۔ حقیقت صرف مٹی ہے جس کا ہر جگہ ایک نام، ایک چہرہ اور ایک رنگ ہے۔ جمیل فاطمہ اور زینب النساء کا بیر شاید آنکھوں کا دھوکا تھا۔ طوائف اور سیدانی کا امتیاز غیر حقیقی تھا۔

پنچھی، بالک، پھول، پھل، الگ الگ آکار
ماٹی کا گھر ایک ہی، سارے رشتے دار

جمیل فاطمہ کے لئے ندا کے پاس جتنے آنسو ہوتے ہیں وہ زیبن کی قبر کی مٹی میں جذب ہو جاتے ہیں۔

اگر قبرستان میں الگ الگ کتبے نہ ہوں
تو ہر قبر میں ایک ہی غم سویا ہوا ہوتا ہے
کسی بیٹے کی ماں، کسی محبوبہ کا عاشق
کسی بہن کا بھائی
تم کسی قبر پر بھی فاتحہ پڑھ کے چلے جاؤ

●●●

روٹی، گھر، کپڑے اور کتابوں کو ایک جگہ کرنے میں اسے بیس سال سے زیادہ لگ گئے۔ الگ الگ سمتوں کے ان باسیوں کی یکجائی کی مدت ہر ایک کے ساتھ مختلف ہوتی ہے۔ ان چند خوش قسمت افراد کے علاوہ جن کو پیدائش سے ہی وراثت میں سب کچھ

مل جاتا ہے۔ سبھی کو انہیں اکٹھا کرنے کے مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ کچھ بنے بنائے راستوں کے مسافر ہوتے ہیں۔ پیدا ہونا، تعلیم حاصل کرنا، نوکری کرنا، گھر بنانا، ندا کو اس مروجہ ترتیب سے جینے کی سہولت حاصل نہیں ہوئی ہے۔ اس نے اپنے لئے جو راستہ منتخب کیا تھا یا حالات نے اسے جس راستے پر ڈال دیا تھا، اس میں مقابلتاً زمین سخت اور آسمان دور تھا۔ اس کے بھائی والدین کے تجربوں کے سائے میں مناسب وقت پر دروازوں پر اپنے اپنے نام کی تختیاں لگا کر باعزت بن گئے۔ ندا کی خودسری نے ان کے تجربوں سے فائدہ نہیں اٹھایا اور بہت سارا وقت یوں ہی گنوا دیا۔

اپنے ہی شہر میں اچانک وہ گھر سے بے گھر ہوکر گوالیار سے سن پینسٹھ کی ایک دوپہر کو بمبئی کے وی ٹی اسٹیشن پر اترا تھا۔ بسنت اسٹوڈیو کے پاس وہ وہاں سے پانچ اپول نامی چھوٹی سی آبادی میں آیا تھا۔ بمبئی کی بڑی بڑی عمارتوں اور لمبے چوڑے فاصلوں سے ٹکرانے کے لئے اس کے ہاتھ میں چند کپڑوں کی ایک اٹیچی اور جیب میں گنتی کے اکیس روپے تھے۔ آج بمبئی میں اس کا اپنا گھر ہے۔ روٹی کپڑے اور کتابوں کے اس اکیلے گھر کو مکمل ہونے میں ابھی ایک عورت کی ضرورت ہے۔ اس عورت کا نام ابھی تک عشرت ہے جو گوالیار کے ایک محلے کے کشادہ گھر میں اپنے والد کے رٹائرمنٹ کے بعد سب سے بڑی لڑکی ہونے کی سزا پوری کر رہی تھی۔ وہ ایک مقامی کالج میں فائن آرٹس کی لیکچرر ہے۔ اس کے گھر میں اس سے چھوٹی پانچ بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ ان سب میں بٹی ہوئی وہ جب کسی شام یا دوپہر کی فرصت میں خود میں جڑنے کا حوصلہ پاتی ہے تو ندا کو خط لکھ دیتی ہے۔

'مجھے میری ذمہ داریوں نے تھکا دیا ہے۔ میں ان سے دور ہوکر تمہارے پاس آجانا چاہتی ہوں۔ لیکن بابو صاحب کا بڑھاپا راستہ روک لیتا ہے۔ اگر میں نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا تو وہ ٹوٹ کے رہ جائیں گے اور یہ صدمہ میں برداشت نہیں کر پاؤں گی۔ مجھے تھوڑا وقت اور دے دو۔ پھر اس کے بعد تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔'

ایسے ہی ایک خط کو دیکھ کر ندا کی بڑی بہن، مرتضیٰ حسن کو لے کر کراچی سے گوالیار آتی ہے۔ وہ اپنے ساتھ صندوق میں مرحومہ جمیل فاطمہ کے دئے ہوئے زیورات اور شادی کے دن دلہن کے پہننے کا موروثی لباس بھی لاتی ہے اور دو تین ہفتے یونہی گنوا کر واپس لوٹ جاتی ہے۔

اس کے مسلسل بٹ کر جڑنے اور جڑ کر بٹنے سے ناراض ہوکر بڑی بہن نئے رشتوں کی تلاش کرتی ہے۔ اس کی خبر جب عشرت کو ہوتی ہے تو ان دیکھے آنسوؤں سے اس کی آنکھیں بھیگنے لگتی ہیں۔ وہ اپنی ایک سہیلی کے یہاں ندا سے ملتی ہے اور وہ ساری باتیں جو وہ کہنا چاہتی ہے، خود خاموش رہ کر اس سہیلی سے کہلواتی ہے۔ ان باتوں میں محبت، انتظار اور مجبوری کے لفظ بار بار سنائی دیتے ہیں۔ اس کے منہ سے رخصت ہوتے وقت صرف ایک جملہ نکلتا ہے:

'میں تم کو چاہتی ہوں، تمہاری خاطر شہر میں بدنام ہوں۔ اس کا خیال رکھنا۔'

اس نئے گھر میں وہ کئی سالوں کے بعد جب سے بمبئی آیا ہے، پہلی بار دوپہر میں ایک گھنٹہ سو کر اٹھا ہے۔ مکان کی چابی اسے صبح ملی ہے اور اب دوپہر ہے۔ وہ کافی تازہ دم محسوس کرتا ہے۔ وہ بیڈروم کی گیلری میں کھڑا دیکھتا ہے کہ سامنے میدان میں مچھیروں کے دیوتا وٹھل کا مندر ہے۔ سرخ کھپریلوں سے ڈھکے ہوئے اس مندر کے قریب مولسری کا پیڑ ہے۔ دائیں طرف جامن کا پرانا درخت ہے۔ جامن کی شاخ پر بیٹھا ہوا طوطا جامن کترتے ہوئے اسے دیکھتا ہے اور پھر پر پھیلا کر اڑ جاتا ہے۔ اسے وہ طوطا اچانک یاد آتا ہے جو عشرت کی پھوپھی سے قرآن پڑھتا تھا جو آج بھی وہیں میدان میں کسی چھوٹی سی قبر میں ابدی نیند میں محو ہے۔ اس کا جسم قبر میں ہے اور روح جنت میں ہے۔ مولسری کے پیڑ میں چھپی چڑیاں دوپہر کی گپ شپ میں مشغول ہیں۔ مندر میں گھنٹیوں کی آواز کی گونج سے چونک کر ایک ساتھ کئی چڑیاں باہر نکلتی ہیں اور ان کے پروں کی سرسراہٹ سے بہت سارے پھول شاخوں سے ٹوٹ کر ہوا میں جھولتے ہوئے فرش پر بکھر جاتے ہیں۔ ڈوبتے سورج کی دھوپ اپنے اجلے ہاتھوں میں ان پھولوں کو لئے مندر کی دیوار پر کھڑی آرتی کا انتظار کر رہی ہے۔ کہیں قریب سے اذان کی دھیمی دھیمی آواز ہوا میں تیرتی ہوئی اس تک آتی ہے۔

'خدا نے میری ساری آرزوئیں پوری کی ہیں لیکن نہ جانے کون سا ایسا گناہ ہے جس کی سزا مجھے اب تک تیری جدائی کی صورت میں مل رہی ہے۔ جب تو گھر بار کا ہوگا تب تجھے احساس ہوگا اولاد کا دکھ کیا ہوتا ہے۔'

جمیل فاطمہ کے ایک خط میں یہ جملے، اذان کے آخری لفظوں سے جھانکتے ہیں۔ اللہ اکبر، اللہ اکبر کی صدا میں ایک چہرہ ابھرتا ہے اور پھر خاموشی بن جاتا ہے۔ تہہ در تہہ خاموشی۔

'.....فسادات ہوتے نہیں ہیں، کرائے جاتے ہیں۔ کرسیوں کی لالچ اہل سیاست کو جانور بنا دیتی ہے، خونخوار جانور! آدمی تو التفات کا کھلونا ہے۔ پیدائش سے پہلے کس سے پوچھا جاتا ہے کہ کون کہاں پیدا ہونا چاہتا ہے۔ جو جہاں آتا ہے وہیں کا ہو جاتا ہے! موتی لال نہرو، پنڈت نہرو، اندرا گاندھی، راجیو گاندھی، ایک ڈھنگ کے گھر میں پیدا ہونے سے، کئی نسلوں تک آدمی بے فکر ہو جاتا ہے۔ زبان، مذہب، دیس، چہرہ سب ایسے ہی اتفاقات کے دائرے ہیں۔'

گوالیار میں نئی سڑک کی ایک دوکان ساہتیہ سنگم میں ندا اپنے ہم عمر دوستوں کے درمیان کسی بحث میں الجھا ہوا ہے۔ وہ اپنے بارے میں خود فیصلہ کرتا ہے۔ اس فیصلے کے بعد وہ خود اپنی نظر میں اہم ہو جاتا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ وہ اچانک بڑا ہو گیا ہے۔

سورج، ہوا اور آسمان کو اپنے بنائے ہوئے گھر کی گیلری سے دیکھنے کا یہ اس کا پہلا تجربہ ہے۔ اسے لگتا ہے ہوسٹل کے کمرے کی کھڑکی، یا کسی کرائے کے روم سے دیکھی ہوئی دنیا اور اپنی گیلری سے نظر آنے والی دنیا، ایک ہی دنیا میں کئی مختلف دنیائیں ہیں۔ دنیا وہی رہتی ہے لیکن دیکھنے والے کے حالات کے لحاظ سے یہ سب کو الگ الگ روپ میں نظر آتی ہے۔ ندا نے ہوسٹل میں کئی سال گزارے ہیں۔ ایک کمرے میں اپنے علاوہ ایک اور کے ساتھ! یہ 'ایک اور' تھوڑے تھوڑے وقفے کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ اس کی عادتیں اور سونے جاگنے کے اوقات بھی ہر نام کے ساتھ مختلف ہوتے ہیں۔ کسی کو رات میں دیر تک بانسری بجانے کا شوق ہوتا ہے، کوئی ضرورت سے زیادہ سوشل ہے لہٰذا اس کے پاس ہمیشہ دوستوں کی بھیڑ ہوتی ہے، کسی کی ہر روز کوئی نہ کوئی چیز گم ہو جاتی ہے جس کے دوبارہ ملنے تک وہ مسلسل کمرے کو اوپر نیچے کرتا رہتا ہے اور جب وہ کھوئی چیز مل جاتی ہے تو تلاش کے پورے واقعہ کو دیر تک اپنے آپ کو سناتا رہتا ہے۔ انہیں 'ایک اور' میں ایک چہرے مہرے سے معقول، لمبا تڑنگا پنجابی نوجوان ہے جو لندن سے بمبئی فلم انڈسٹری میں اپنی مردانہ وجاہت کی دھاک بٹھانے آیا ہے۔ جب دھرمیندر ہوسٹل میں رہ کر ہیرو بن سکتا ہے تو اس میں کمی کیا ہے؟ اس کا رہن سہن اور کپڑے جوتے، ہوسٹل میں دوسرے رہنے والوں سے الگ ہیں۔ وہ ناشتہ یا کھانا باہر جا کر ہوٹل میں نہیں کھاتا، ہوٹل کا لڑکا لے کے آتا ہے اور ہر پھیرے میں معقول ٹپ پاتا ہے۔

وہ جب بھی بن سنور کر باہر نکلتا ہے تو پوری فضا میں خوشبو جاگ جاتی ہے۔ سب اسے مڑ مڑ کر دیکھتے ہیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں ہاسٹل کے سارے اجنبی اس کے دوست بن جاتے ہیں۔ پہلے وہ شام ہوتے ہی بوتل کھول کر اکیلا ہی فلم انڈسٹری میں اپنی کامیابی کے خواب دیکھتا تھا، نئے نئے وعدوں کے تیر آسمان میں پھینکتا تھا، جب ندا کمرے میں ہوتا تھا تو اسے بھی شریک کر لیتا تھا لیکن بعد میں اب بن بلائے بہت سے مہمان اس کی تنہائیوں میں شامل ہونے لگتے ہیں۔ رات کی اس کی میزبانیاں کافی مشہور ہو چکی ہیں۔ اس شہرت نے دوسروں کی ضرورتوں کی اس سے توقعات بڑھا دی ہیں۔ اب ضرورتیں ادھر ادھر

بھٹکنے کے بجائے سیدھے اس کے پرس تک آ جاتی ہیں۔ ایک پرس اور بہت ساری مسلسل ضرورتیں۔ وہ پریشان ہونے لگتا ہے۔ ایک شام کچھ دیر وہ خاموش رہ کر تیار ہوتا ہے اور باہر نکلنے سے پہلے سب کے سامنے ندا سے کہتا ہے، 'یار آج بہت کڑکی ہے۔ بیس پچیس روپئے ہوں تو ادھار دے دو۔ جیسے ہی کہیں سے پیسے آ جائیں گے لوٹا دوں گا۔' اس کے اس جملے سے دوسرے تو حیرت زدہ ہوتے ہی ہیں، خود ندا کو بھی تعجب ہوتا ہے۔ اس ادھار کے بعد وہ دوسروں کی توقعات کے اونچے سنگھاسن سے اتر کے ویسا ہی بن جاتا ہے جیسے دوسرے ہیں۔ طبقاتی فرق کے مٹتے ہی لوگوں کی نہ صرف اس میں دلچسپی ختم ہو جاتی ہے، سلام دعا کی وہ عزت بھی اسے ملنا بند ہو جاتی ہے جو اب سے پہلے آتے جاتے اسے ملتی تھی۔ ندا سے لئے ہوئے پیسے ندا کو اسی شام واپس مل جاتے ہیں۔ اس کا پرس جیسے پہلے تھا ویسا ہی اب بھی ہے لیکن ہوسٹل والوں میں اس کے افلاس کی شہرت بدستور قائم رہتی ہے۔ یہ شہرت اس کی خود ساختہ غریبی کے بہت کام آتی ہے۔ وہ جب تک یہاں رہتا ہے، اسے یہ بے فکر نیند بھی سلاتی ہے اور اس کی امیری کو دوسروں کی طرح مفلس ہونے سے بھی بچاتی ہے۔ کئی مہینوں کی تگ و دو کے بعد بھی اسے متوقع کامیابی نہیں ملتی تو اس کی امیری بھی اس سے منھ موڑنا شروع کر دیتی ہے۔ ایک دن ندا کو اپنی میز پر اس کا ہاتھ کا لکھا ہوا ایک کاغذ ملتا ہے۔

آج میں واقعی ضرورت مند ہوں۔ ہو سکے تو پانچ سو روپئے میری ڈائری میں رکھ دینا۔ یہ رقم پہلے کے بیس کی طرح تمہیں فوراً نہیں ملے گی۔ کچھ دن بعد ہی دے پاؤں گا۔

ان پیسوں سے وہ ریستوران کا بل ادا کرتا ہے، ہوسٹل کا کرایہ دیتا ہے اور باقی جو بچتا ہے اس سے وہ دو بوتل شراب لاتا ہے اور ان سب کو پلاتا ہے جو اس کے افلاس پر ترس کھا کر اس سے ادھار مانگنا چھوڑ چکے تھے۔ پینے والوں کی رائے اچانک اس کے بارے میں بدل جاتی ہے۔ اپنی غریبی کو اس طرح امیر بنا کر وہ جس بستر پر سوتا ہے وہاں سے دوبارہ خود نہیں اٹھتا، اٹھایا جاتا ہے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اس کی موت خودکشی ہے۔ اس کی لاش دو تین دن گھر میں لاوارث پڑی رہتی ہے۔ پھر ان سبھی کے چندے سے جن کو شروع میں اس نے ادھار دیا تھا، اسے آگ کے

حوالے کر دیا تھا، اسے آگ کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ ندا کئی دن تک اس کی موت کو بھی اس کا کوئی ناٹک سمجھتا ہے۔ اسے لگتا ہے وہ کسی شام کو پھر ہنستا ہوا اس سے ملے گا اور کہے گا، کیوں، کیسا ناٹک کیا میں نے؟ ہوسٹل میں سکون سے رہنے کے لئے اس قسم کے ناٹک ضروری ہوتے ہیں۔

پالی ناکہ کے اس ہوسٹل میں سبھی فلم اسٹرگلر ہیں۔ پنجاب، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان، بنگال وغیرہ سے آئے ہوئے، اپنے گھر بار دور، یہ سب دن میں اپنے اپنے خوابوں کے پیچھے بھاگتے دوڑتے ہیں اور رات کو الگ الگ کمروں میں دیر تک نشے میں ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے ہیں۔ یہ لڑائی کبھی کبھی قریب کے پولیس اسٹیشن تک پہنچ جاتی ہے اور باقی رات وہیں آرام کرکے سویرے ہاسٹل میں واپس آتی ہے۔ اس ہاسٹل میں سب کے اپنے خواب چہرے ہیں۔ کوئی نغمہ نگار بننا چاہتا ہے، کوئی سنگیت کی دنیا میں تہلکہ مچانا چاہتا ہے، کوئی ہیرو، کوئی ویلن ہے لیکن سب مہینوں سے بیکار ہیں۔ جس کو ہیرو بننا ہے وہ لنکنگ روڈ کے ایک بڑے ہوٹل میں ویٹر کا کام کرتا ہے۔ ویلن باندرہ سے گوشت لاکر گھروں میں سپلائی کرتا ہے۔ صابرت نغمہ نگاری کے شوق کو ملتوی کرکے فلم رائٹرز ایسو سی ایشن کے سکریٹری اور کرشن چندر کے چھوٹے بھائی مہندر ناتھ کی مدد سے انہیں پر 'فن اور شخصیت' کا پہلا نمبر پلان کر رہا ہے۔ کرشن چندر اپنے ہوتے ہوئے، اپنے بھائی پر کسی نمبر کے نکالے جانے کے خلاف ہیں لیکن اشتہاروں کی مدد سے نمبر نکلتا ہے مگر مہندر ناتھ کو اپنا یہ نمبر دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔ مہندر ناتھ کے بعد دوسرا نمبر جانثار اختر پر ہوتا ہے۔ وہ بھی اسے دیکھتے ہی اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں۔ ان دو حادثوں کے بعد صابر دت جس کسی کے فن اور شخصیت پر نیا شمارہ پلان کرتا ہے وہ ڈر کے اپنا نام واپس لے لیتا ہے۔ سب کو اپنی زندگی سے زیادہ پیار ہو گیا ہے اور صابر پھر سے بیکار ہو گیا ہے۔ ان بے کاری کے دنوں میں وہ ایک ایسے اردو ادیب یا شاعر کی تلاش میں ہر گھڑی مصروف رہتا ہے جو اس کے کہنے پر مرنے پر رضامند ہو۔ کچھ دنوں سے ہوسٹل میں ندا کے کمرے میں 'ایک اور صابر ہے۔

اس ہوسٹل میں ایک میوزک ڈائرکٹر ندا پر کافی مہربان ہیں۔ وہ ہر وقت اپنے کمرے میں ایک پرانے سے ہارمونیم پر ان فلموں کے لئے دھنیں بناتے رہتے ہیں جو کئی سال سے انہیں ملنے والی ہیں لیکن ابھی تک ملی نہیں۔ ندا سے ان کی ملاقات ہوسٹل میں کم، ہوسٹل کے باہر ہوٹل میں زیادہ ہوتی ہے۔ وہ ناشتے کے وقت جب بھی آتے ہیں، ندا کے لئے ایک نئی فلم کا آفر لاتے ہیں اور چائے پی کے چلے جاتے ہیں۔ ان کو اس ہوسٹل میں آئے چند مہینے ہی گزرے ہیں لیکن ان فلموں کی تعداد جن میں ندا ان کے ساتھ گیت لکھنے والا ہے، اب ان کے قیام کے مہینوں سے تگنی چوگنی ہو چکی ہے۔ اتنی ساری فلموں کے بعد بھی ندا پر ان کی مہربانیاں کم نہیں ہوتیں۔ ان کی گنتی بڑھتی ہی رہتی ہے لیکن ندا کے پاس ہی اب آفر لینے کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔ اب وہ ان کی نئی فلموں کے لئے وقت نہیں نکال پاتا اور انہیں دیکھتے ہی ہوٹل سے اٹھ جاتا ہے۔ انہیں ندا کے رویئے سے تکلیف ہوتی ہے اور وہ کئی دن کے لئے خاموش ہو جاتے ہیں۔ وہ اب ندا کو اپنی نئی دھنیں بھی نہیں سناتے۔ کچھ دن بعد وہ ہوسٹل چھوڑ کر کلکتہ واپس چلے جاتے ہیں۔ کئی سال نظر نہیں آتے، اچانک ایک دن کانگریس ہاؤس کے دفتر میں اختر کے مجرے میں ہارمونین بجاتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ندا کو پہچان لیتے ہیں۔ پہلے وہ پردیپ رائے تھے اور اب شمشاد خان ہیں۔ اختر کے پہلے کے دونوں لڑکے اب انہیں کی ولدیت سے اسکول میں داخل ہیں۔ وہ اختر کے ساتھ مل کر ایک نئی فلم کی تیاری میں ہیں۔ اس فلم میں ہیروئن اختر طوائف ہے اور میوزک ڈائرکٹر وہ خود ہیں۔ لیکن اس فلم کے شروع ہونے سے پہلے ہی اختر فلم کو اپنے ساتھ لے کر دبئی چلی جاتی ہے۔ وہ ایک عرب کے بڑھاپے کو جوان خواب دکھاتی ہے اور ریال کماتی ہے۔ اختر کے دونوں لڑکے اب شمشاد خان کے ساتھ ہیں۔ وہ پنج وقتہ نمازی بن جاتے ہیں۔ ان نمازوں سے جب انہیں فرصت ملتی ہے تو ان لڑکوں کو پاس بٹھا کر اپنی آخری دبئی گئی ہوئی فلم کی دھنوں کو عبادت کی طرح گاتے ہیں۔ چپ چاپ آنسو بہاتے ہیں۔ اس کے لئے لکھے ہوئے گیت ندا پرائیوٹ کیسٹ اور فلموں میں دے چکا ہے۔

آج گیلری سے اسے جس طرح دنیا نظر آتی ہے، اس نے اس میں ایک ساتھ کئی خواہشیں جگا دی ہیں۔ وہ چاہتا ہے بچپن کی طرح بہت سے پیسے چڑی مار کو دے کر بہت سی چڑیاں اس کے پنجرے سے آزاد کروا دے۔ وہ چاہتا ہے شام ہوتے ہی کسی قبرستان میں جائے اور کسی ایک قبر پر ڈھیر ساری اگربتیاں جلائے اور ایک ساتھ کئی قبروں پر فاتحہ پڑھ کر چلا آئے۔ وہ چاہتا ہے سمندر کے کنارے کسی سنسان گوشے میں بیٹھ کر آتی جاتی لہروں پر کئی بھولے بسرے چہرے بنائے۔ وہ چاہتا ہے ماضی کی کسی خوشی کو یاد کرکے اتنا ہنسے کہ آنکھوں میں آنسو چمک اٹھیں۔

اسے یاد آتا ہے، ایک لمبے عرصے سے اسے اچھی طرح رونے کی فرصت ہی نصیب نہیں ہوئی۔ جمیل فاطمہ کے گزر جانے کا جب اسے تار ملتا ہے، وہ دوستوں میں گھرا ہوتا ہے۔ مرتضیٰ حسن کا غم روزی روٹی یا دانے پانی کو بھاگ دوڑ میں کہیں چھوٹ جاتا ہے اور بھی کئی چھوٹے بڑے دکھ اسی طرح آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ وقت کے اس پورے دور میں اس کا سارا رونا آنکھوں سے دور، اس کے اندر کہیں جمع ہوتا رہتا ہے اور وہ لگاتار ہنستا رہتا ہے۔

شہر میں سب کو کہاں ملتی ہے رونے کی جگہ
اپنی عزت بھی یہاں ہنسنے ہنسانے سے رہی

❑❑❑

ندا فاضلی کی دیگر معروف و مقبول نثری تصانیف اور 'دیواروں کے بیچ'

سلام بن رزّاق

ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ یافتہ
بین الاقوامی شہرت کے افسانہ نگار
یوپی، بہار اور مہاراشٹر اردو اکادمی
ایوارڈ، غالبؔ ایوارڈ کے علاوہ کتھا ایوارڈ
سے بھی سرفراز، درجنوں کتابوں کے مصنف
متعدد ٹی وی سریل اور بالی ووڈ
فلموں کے اسکرپٹ رائٹر

B-603، نیا نگر، میرا روڈ
تھانے (مہاراشٹر)
رابطہ: 9967330204

ندا فاضلی کا شمار ہمارے عہد کے نامور شعرا میں ہوتا ہے مگر اپنے معاصرین میں اُن کا نام اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ وہ نہ صرف ایک خوش فکر شاعر تھے بلکہ ایک صاحبِ طرز نثر نگار بھی تھے۔ ملاقاتیں، دیواروں کے بیچ، دیواروں کے باہر، چہرے اور دنیا مرے آگے، اُن کی نثری تصانیف ہیں۔

'ملاقاتیں' اُن کی پہلی نثری تصنیف تھی جس میں انھوں نے علی سردار جعفری، فراق گورکھپوری، اختر الایمان، ساحر لدھیانوی، خواجہ احمد عباس، ظ انصاری، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی جیسی شخصیتوں سے انٹرویو لیے تھے۔

یہ کتاب اپنے لب ولہجہ کے لحاظ سے نہ صرف منفرد ہے بلکہ اپنی اس پہلی تصنیف سے ہی ندا نے اردو داں حلقے میں اپنی نثر کا لوہا منوالیا تھا۔ وارث علوی تو اُن کی نثر کے زبردست مداح تھے۔

یہ 'ملاقاتیں' عام انٹرویو سے اس لیے مختلف تھیں کہ ان میں مصنف نے رسمی گفتگو سے احتراز برتتے ہوئے مخاطب کے ساتھ ایک دانشورانہ مکالمہ قائم کیا ہے۔ اُنھوں نے ایک منجھے ہوئے آرٹسٹ کی طرح صرف پورٹریٹ بنانے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ایسے ماسٹر اسٹروک لگائے ہیں کہ شخصیت کی باطنی کیفیات کے چند گوشے بھی روشن ہوجاتے ہیں۔ مصنف مخاطب کی گفتگو کو من وعن بیان نہیں کرتا بلکہ ایک ماہر نفسیات کی طرح اس کا تجزیہ بھی کرتا چلتا ہے۔ ان ملاقاتوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے بڑے ادیبوں اور شاعروں کو عظمت کے آسن پر بٹھانے کی بجائے اُنھیں اُن کی خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ بشری پیکر میں پیش کیا ہے۔ ان ملاقاتوں کو پڑھتے ہوئے قاری کے دل میں اُن شخصیتوں کے لیے عقیدت سے زیادہ محبت کا جذبہ بیدار ہوتا ہے اور وہ تمام شخصیتیں اپنی سی لگنے لگتی ہیں۔

اُن کی ایک اور کتاب 'چہرے' اُن شعرا کی شخصیات پر مشتمل ہے جو اپنے زمانے میں مشاعروں کی آبرو سمجھے جاتے تھے۔ ان مضامین کے توسط سے مصنف نے اردو زبان کی مقبولیت اور ادب وثقافت میں مشاعروں کی اہمیت پر بڑی نکتہ رسی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ کتاب میں شامل تمام شعرا کا شمار اپنے عہد کے نامور شعرا میں ہوتا تھا۔ ندا کی دلچسپ اور پُرکشش نثر نے اُن شخصیتوں کی چمک دمک میں مزید اضافہ کردیا ہے۔

'دنیا مرے آگے' پہلے ہندی میں 'تماشا مرے آگے' کے نام سے چھپی بعد میں اردو میں 'دنیا مرے آگے' کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں مختلف ادبی شخصیات کے علاوہ ادبی موضوعات پر کچھ ہلکے پھلکے مضامین بھی شامل ہیں۔ نثر میں ندا فاضلی کی سب سے اہم تصنیف 'دیواروں کے بیچ' ہے جسے قارئین اور ناقدین نے یکساں طور پر شرف قبولیت بخشی۔ اس پر اختلاف ہوسکتا ہے کہ یہ خودنوشت ہے، سوانحی ناول ہے یا ناول ہے، لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ یہ ایک فکر انگیز اور دلچسپ تصنیف ہے جس میں مصنف نے اپنے بیباک قلم سے نہ صرف اپنی زندگی کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ سماج کے بعض نازک گوشوں سے بھی پردے اُٹھائے ہیں۔ ہر چند کہ اردو میں لکھی گئی سابقہ خودنوشتوں کے مقابلے میں 'دیواروں کے بیچ' کا قلم زیادہ بیباک اور دھاردار ہے، مگر جب ہم دوسری زبانوں بالخصوص مراٹھی زبان میں لکھی گئی دلتوں کی خود نوشتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اردو ادیب میں صداقتوں کو برہنہ کرنے کی جرأت ابھی پوری طرح پیدا نہیں ہوئی ہے۔

مثال کے طور پر ندا اور عشرت کے رشتے میں کچھ ایسی گرہیں پڑی ہوئی نظر آتی ہیں جنھیں قاری کوشش کے باوجود کھول نہیں پاتا۔ ندا کے تئیں عشرت کا رویّہ عجیب معماتی سا ہے۔ دونوں ذہنی طور پر قریب ہیں جسمانی طور پر بھی قریب آجاتے ہیں۔ مگر ان دونوں کے درمیان وہ کون سی گرہ تھی جو آخر تک کھُل نہیں پائی، مصنف اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتا اس لیے عشرت کا کردار ایک جیتا جاگتا کردار بننے کی بجائے صرف پرچھائیں بن کر رہ گیا ہے۔ اس کے باوجود کتاب میں کچھ کردار ایسے ہیں جو قاری کو یاد رہ جاتے ہیں۔ ان میں ندا کی والدہ جمیل فاطمہ کا کردار پوری کتاب میں برگد کی چھاؤں کی طرح چھایا ہوا ہے جس کے ٹھنڈے سائے میں دوسرے کردار کچھ دیر سُستاتے اور پھر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

جمیل فاطمہ کے کردار میں ممتا کا تقدس، نسوانی پاکیزگی اور ایک خاتونِ خانہ کی ذمہ داریوں کا کچھ ایسا امتزاج ہے کہ وہ ایک مکمل اور آئیڈیل مشرقی خاتون کے روپ میں ذہن پر ایک گہرا نقش چھوڑ جاتی ہیں۔ اس کے برعکس مرتضیٰ حسن اپنی شخصیت کی بوقلمونی کے باوجود کوئی یادگار کردار نہیں بن پائے۔ جب کہ مصنف یا ندا کی ذہنی وابستگی جمیل فاطمہ سے زیادہ مرتضیٰ حسن ہی سے ہے۔ اسی لیے تو ندا ان کی موت پر ایک تاثر انگیز نظم کہتا ہے۔ کراچی سے ماں کی موت کی خبر ملنے پر ہندوستان میں اپنے باپ کی داشتہ زبیُن کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھنا اس بات کا اشارہ کرتا ہے کہ ندا کو زبیُن میں اپنی ماں کی ممتا کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ واقعہ رشتوں کی بوقلمونی پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔

مرتضیٰ حسن شاعر ہیں، عورتوں سے آشنائیاں کرنے میں طاق ہیں اس لیے شادی کی اخلاقی پابندیوں کے باوجود زندگی کو پوری آزادی سے جینے کے قائل ہیں۔ لہٰذا شادی کے بعد بھی ان کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آتا۔ زبیُن کو ندا سے خاص لگاؤ ہے، غالباً اس لیے اسے ندا کے لاابالی پن میں مرتضیٰ حسن کی شخصیت کی جھلک نظر آتی ہے۔ مرتضیٰ حسن پاکستان جانے کے بعد وہاں کے معاشرے میں ڈھل کر اسلامی ہوجاتے ہیں۔ مگر یہاں زبیُن 'اِک شمع رہ گئی ہے' وہ بھی خموش ہے کی منہ بولتی تصویر بن جاتی ہے۔ زبیُن کا انجام قاری کو تھوڑی دیر کے لیے مضطرب کردیتا ہے اور اس جاگیردارانہ سماج کی یاد دلاتا ہے جس میں مرد کا اپنی منکوحہ عورت کے علاوہ دوسری عورتوں بالخصوص طوائفوں کو اپنی داشتہ بنانا ایک عام رواج تھا۔

اس کتاب میں بیر کمار اور شیلا کے کردار کو بھی قاری آسانی سے فراموش نہیں کرسکتا۔ بیر کمار کا جیل جاتے جاتے ندا کے لیے کالج کی فیس کا انتظام کرجانا منٹو کے کرداروں کی یاد دلاتا ہے جو گردن، گردن گناہ آلود دلدل میں دھنسے ہونے کے باوجود اپنی کسی نہ کسی 'ادا' سے اپنے 'انسان' ہونے کا ثبوت فراہم کردیتے ہیں۔ شیلا جو بیر کمار کی محبوبہ ہے اس کے مرنے کے بعد طوائف بن جاتی ہے اور ایک دن خود ندا جب اس سے ٹکراتا ہے تو دونوں بیر کمار کی یاد میں جسمانی دوریوں کو عبور کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ یہ واقعہ جذباتی اور نفسیاتی اعتبار سے ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ یہاں نفسانی خواہش سے زیادہ انسانی رشتوں کی کشاکش یا جذبات کے تصادم کو پوری شدّت سے بیان کرنے کا موقع تھا مگر، مصنف اس واقعہ سے سرسری سا گزر جاتا ہے، جس سے قاری کی تشفی نہیں ہوتی۔ ندا جب شیلا کو فیس دینا چاہتا ہے تو وہ سنجیدگی سے کہتی ہے:

''تم میرے مرد کے دوست ہو، وہ تمھیں بہت چاہتا تھا، میرے تمھارے بیچ گاہکی کیسے ہوگی، گھر کے لوگوں سے بھی کوئی لین دین کرتا ہے؟'' شیلا کے یہ الفاظ دراصل ایک طوائف کے الفاظ ہیں مگر ان الفاظ کے پیچھے جو اخلاقی قدر یا جو جذباتی نکتہ ہے وہ شیلا کے کردار کو کوٹھے سے اُٹھا کر مندر کی وَیدی پر بٹھا دیتا ہے۔

مصنف نے اپنے اطراف کے ماحول اور کرداروں کے اندر بساط بھر جھانکنے اور انھیں پرت پرت کھولنے کی کوشش کی ہے مگر اوّل تو 'دیواروں کے بیچ' میں ایسا کوئی بڑا کردار نہیں ہے جو اردو فکشن میں ایک یادگار کردار کی حیثیت سے زندہ رہ جائے۔ دوسرے نہ کسی کردار میں ایسی پیچیدگی ہے جس کی گرہ کشائی میں مصنف کو اپنے قلم کا انتہائی جوہر صَرف کرنا پڑا ہو۔ ندا، جمیل فاطمہ اور مرتضیٰ حسن کو چھوڑ کر تمام کردار ریل کے مسافروں کی طرح مختلف اسٹیشنوں پر چڑھتے اُترتے آنکھوں سے اوجھل ہوجاتے ہیں۔ مگر مجموعی اعتبار سے یہی چھوٹے چھوٹے کردار کتاب کی دلچسپی کو برقرار رکھتے ہیں اور قصے کے تسلسل کو قائم رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ جیسے اجنبی عورت کی بھری

جوانی کو سر نہ کر پانے کی صورت میں آنسو بہاتا خیر الدین عرف خیرو بھائی کا بڑھاپا، کالج میں ندا کی کلاس فیلو مس ٹنڈن، جس کا مہکتا، چہکتا بدن اور سنجیدہ رکھ رکھاؤ ندا کے ذہن میں نئی شعری جمالیات کا تجسس جگا دیتا ہے۔ سونالی جو مروجّہ نظام کے جبر اور نا انصافی کے خلاف لڑنے اور احتجاج کرنے والے گروہ کی ایک فرد ہے۔

کتاب میں سلام مچھلی شہری کا کیری کیچر خوب ہے، پورا خاکہ کفایت لفظی کا عمدہ نمونہ ہے۔ ندا اِس ناول نما سوانح یا سوانح نما ناول کا مرکزی کردار ہے جو ایک خاموش تماشائی کی طرح دنیا اور معاملاتِ دنیا کو دیکھ یا بھوگ رہا ہے۔ مگر اس کی شخصیت خود اپنی داخلیت کے بوجھ سے اس قدر گراں بار ہے کہ قاری کے اندر کوئی حوصلہ، کوئی اُمنگ یا کوئی تڑپ پیدا نہیں کر پاتی۔ ندا کے کردار کو کچھ اس احتیاط سے تراشا گیا ہے کہ کتاب کے دوسرے کردار اس کے گرد حرکت کرنے یا اس سے متصادم ہونے کی بجائے اس کا طواف کرتے نظر آتے ہیں۔

کتاب میں پجاری کا مورتی سے پھول اُٹھا کر ندا کے ہاتھ میں رکھنا اور ندا کے بیمار پڑنے پر عیادت کے لیے اس کے گھر جانا دھرم اور مذہب سے ہٹ کر انسانی رشتے کی عظمت کا اشاریہ ہے۔ تقسیمِ ملک کے ہنگاموں کے بعد نئے پجاری کا ندا کو پہچاننے سے انکار کر دینا ظاہر کرتا ہے کہ تقسیمِ ملک سے پہلے ہندو اور مسلمان کے درمیان انسانیت ایک قدرِ مشترک تھی مگر تقسیم کے بعد سیاست کی ایک موہوم لکیر نے زمین کے ساتھ انسانی قدروں کو بھی تقسیم کر دیا۔ انسانی رشتے کی پاکیزگی اور تاریخ کی اس جبریت کو مصنف نے گلاب اور زخم کے استعارے سے ظاہر کیا ہے۔ تقسیم کے بعد بھوپال میں پناہ گزینوں کے کیمپ کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ اس زمانے میں برِّ صغیر کے مختلف پناہ گزین کیمپوں کا ایک عبرت خیز نمونہ ہے۔

'دیواروں کے پیچ' اسکرین پلے کی تکنیک میں لکھی گئی ہے، اس میں ہمیں کوئی پلاٹ نہیں ملتا مگر مصنف نے ندا کے بچپن سے لے کر جوانی تک کے بکھرے ہوئے واقعات کو جمالیاتی رنگ آمیزی کے ساتھ مربوط کرنے کی کوشش کی ہے جس سے پیرایۂ بیان میں قصہ گوئی کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ شان بھی پیدا ہوگئی ہے۔ زبان و بیان پر مصنف کی گرفت مضبوط ہے۔ وہ معمولی سی بات کو بھی غیر معمولی طور پر پیش کرنے کے ہنر سے واقف ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ ایک معمولی سے چیونٹے کی تگ و دو کی جزیات کو ایسی فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے کہ مصنف کی قوتِ مشاہدہ کی بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ تین صفحات پر مشتمل ایک غیر اہم واقعہ کو مصنف نے اپنے بیان کے جادو سے غیر معمولی بنا دیا ہے۔ اس واقعہ کو پڑھتے ہوئے ہیمنگ وے کا مشہور ناول (Old Man and sea) یاد آجاتا ہے۔ مصنف نے چیونٹے کے پردے میں انسانی جدوجہد اور قدرتی آفات سے اس کی مبارزت اور تصادم کو تمثیلی پیرائے میں بیان کیا ہے۔ یہاں زندگی اور موت کے ازلی رشتے کے ساتھ ساتھ جبر و اختیار کی نکتہ آفرینی کا کمال بھی موجود ہے۔ اس واقعہ کی حد تک اسکرین پلے کی تکنیک بہت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ مگر پوری کتاب اس کی متحمل نظر نہیں آتی۔

زمانۂ حال کے صیغے میں ایک آدھ افسانہ تو لکھا جا سکتا ہے مگر اس صیغے میں پوری کتاب کا مطالعہ قاری کو تھکا دیتا ہے۔ اس سے واقعات کی روانی بھی متاثر ہوتی ہے۔ بعض جگہ خود کلامی کا سا گمان ہوتا ہے۔ دراصل تکنیک کے اعتبار سے مصنف تذبذب کا شکار معلوم ہوتا ہے۔ اس کے پاس زندگی کے تلخ و شیریں تجربات کا انبار ہے مگر انھیں ناول کے فارم میں ڈھالنے کے لیے جو معروضی نقطۂ نگاہ کی ضرورت ہے وہ مفقود ہے۔ کتاب کے آخری پچاس صفحات میں ممبئی کا تذکرہ ملتا ہے۔ مصنف نے ممبئی میں اپنی عمر کا تقریباً نصف حصہ گزارا ہے۔ حالات کے سرد و گرم بھی سہے ہیں اور تلخ اور ترش تجربات سے بھی گزرا ہے۔ مگر ممبئی کی ادبی سرگرمیوں، ادبی شخصیتوں اور ممبئی میں اپنے شب و روز کا ذکر کچھ اس قدر پھیکا پھیکا سا ہے کہ کتاب کا یہ حصہ محض ڈائری معلوم ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ اپنے ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کا ذکر کچھ اس انداز سے کیا گیا ہے جیسے یہ ساری شخصیتیں ممبئی میں ندا کی پذیرائی اور دل بستگی پر معمور کی گئی ہوں۔ مصنف یہاں اپنے اطراف کے ماحول کی گہرائی میں غوطہ لگانے کی بجائے صرف سطح پر تیرتا نظر آتا ہے۔ اس لیے کتاب کا یہ حصہ قاری کو متاثر نہیں کرتا، اس کے باوجود اگر ایک طرف زبان کی دلکشی کتاب کو دلچسپ بناتی ہے تو دوسری طرف مصنف کی نکتہ سنجی اور فقروں کی بلاغت قاری کو دعوتِ فکر بھی دیتی ہے۔ مثلاً

''دوسرے کے غم کو بہانہ بنا کر ہم اکثر اپنے ہی کسی غم کو روتے ہیں۔''

''خدا آسمان سے اُتر کر موت کی خوشبو کی طرح مسجد کے آنگن میں پھیل جاتا ہے''

''چہروں اور ناموں کے امتیازات زندگی کے واہمے ہیں۔ حقیقت صرف مٹّی ہے جس کا ہر جگہ ایک نام، ایک چہرہ اور ایک رنگ ہے۔''

ایسے بلیغ فقرے کتاب میں ورق ورق بکھرے ہوئے ہیں۔

یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ 'ملاقاتیں' کے بعد 'دیواروں کے پیچ' لکھ کر مصنف نے ایک بار پھر اپنی نثر کا لوہا منوالیا۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں ہو سکتی کہ اردو کی خود نوشتوں یا سوانحی ناولوں میں 'دیواروں کے پیچ' اپنے اسلوب کی انفرادیت اور بیباکیٔ اظہار کے سبب عرصے تک یاد رکھی جائے گی۔

❑❑❑

ندا فاضلی کی زندگی کی پیچیدہ نفسیاتی گرہیں اور 'دیواروں کے بیچ'

عتیق اللہ

معروف نقاد و محقق

'ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ' اور 'مغرب میں تنقید کی روایت' جیسی گرانقدر ادبی خدمات، چار شعری مجموعے اور ۲۹ کتابوں کے مصنف، مختلف اعزازات سے سرفراز، بنیادی طور پر شاعر، دہلی یونیورسٹی میں پروفیسر کے عہدہ سے سبکدوش، وطن اجین

C125، بسیرا اپارٹمنٹ، نور نگر ایکسٹینشن

جامعہ نگر، نئی دہلی

رابطہ: 9810533212

اردو میں سوانح نگاریوں اور خودنوشت سوانح عمریوں کی تعداد سوانحی ناولوں سے یقیناً کئی گنا زیادہ ہے۔ ان خودنوشتوں میں بھی پردہ داری اور اعتراف کی جرأت کا مظاہرہ کم اور پردہ پوشی اور خودرائی کا پہلو زیادہ حاوی ہے۔ اکثر خودنوشتیں محض یادداشتوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ جنہیں یادنگاری کے ذیل ہی میں شمار کرنا چاہئے۔ سوانحی ناول سوانح بھی ہوتا ہے اور جس میں اپنے یا کسی دوسرے کے سوانح کو کسی ایک کسے بندھے یا ڈھیلے ڈھالے پلاٹ میں ادا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سوانح نگار یا خودنوشت نگار چونکہ ناول کے آرٹ سے کم واقف ہوتے ہیں اس لئے ان سے پلاٹ کے نظم و ضبط اور واقعات کے تانے بانے جوڑنے کے افسانوی فن کی توقع بے سود ہوگی جسے ایک فکشن نگار بڑی مہارت کے ساتھ کوئی خاص ذیلی تنظیم دے دیتا ہے۔ ذیلی اس لئے کہ اسباب و علل کے منطقی سلسلے کے مطابق ناول کی ظاہری ساخت کو تشکیل دینا اب ناول کے ترقی یافتہ سیال فارم کے عین منافی ہے۔ عزیز احمد، عبداللہ حسین اور قرۃ العین سے لے کر عبد الصمد مستنصر حسین تارڑ کی ظاہری تنظیمی ساخت کو بار بار چیلنج کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔ اب ناول انسانی فطرت اور انسان کے بے ہنگم سفر حیات کی اس رَو کا زیادہ مظہر ہے جس کی منطق خارج کی تعین کردہ زمان کی رو کے برخلاف ترتیب اور نظم کے اپنے متنوع قواعد سے پہچانی جاتی ہے۔ اسی بہ ظاہر بدنظمی نے ناول کو ایک وسیع تر داخلی میدان کار زار بھی فراہم کیا ہے۔ جواز میں جو توضیح اور استدلال کا پہلو چھپا ہوا ہے اس سے یقیناً ہمارے قارئین کو بڑی تشفی حاصل ہوتی ہے لیکن جواز کی گفتگو اور قاری کو قائل کرنے کی عجلت میں ہم ایسے بہت سے قاریوں سے محروم بھی ہو جاتے ہیں جو واردا توں اور واقعات کے اسباب و جواز کی کسی ایک منطق ہی کو آخری دلیل نہیں مانتے۔ ہر قاری اور عہد کے ساتھ استدلال کی منطق بھی تبدیل ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں جدید ناول کا فن پہلے کی نسبت زیادہ پہلودار، زیادہ سیال اور زیادہ وسیع ہوا ہے۔

امراؤ جان ادا، علی پور کا ایلی، الکھ نگری اور غالب جیسے ناولوں میں سوانح اور ناول کا فارم ایک دوسرے میں حل ہو گئے ہیں۔ ناول نگار اگر نفسیاتی بصیرت بھی رکھتا ہے تو وہ زیادہ بہتر طریقے سے اس کردار کی روح اور فطرت کے ان متنوع اطراف کی تفصیلات بہم پہنچا سکتا ہے جو بہتوں کے لئے نامعلوم کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس معنی میں ممتاز مفتی کو ہم بغیر کسی لاگ لپیٹ کے Naturalist of Souls کا نام دے سکتے ہیں۔

اس ڈھب کا فنکارانہ اظہار کی غیر معمولی جرأت سے بھی کام لیتا ہے، اعتراف کے حوصلے بھی جہاں تہاں آزماتا ہے اور خودکشائی کی اس توفیق کے مظاہرے کی ہمت بھی رکھتا ہے جسے ایک خاص تہذیبی تناظر میں پرورش یافتہ انا اپنی تاکید میں رکھنے کے درپے رہتی ہے۔

خودگزشت ناولوں کا معاملہ تو سوانحی ناولوں سے زیادہ خطرناک ہے۔ اکثر خودگزشت نگار اپنی ذات اور کسی حد تک اپنے تعصّبات سے پرے ہوکر چیزوں کو دیکھنے کے باوجود خود احتسابی کی ایک حد قائم کر لیتے ہیں۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ چیزوں کی بہتر فہم کے لئے معروضیت ہی سب سے بہتر اور واحد راستہ ہے۔ بعض اوقات وہ دھندا اور وہ اسرار بھی زیادہ معنی گیر ثابت ہوتے ہیں جن پر دلیل کا بھاری بوجھ ڈالنے سے معنی کی متوقع قدر کے کوتاہ ہو جانے کا ڈر لاحق ہوتا ہے نیز یہ کہ چیزوں سے روحانی ربط پیدا کرنے کی راہیں بھی سمٹ کر رہ جاتی ہیں۔ 'کار جہاں دراز ہے' میں قرۃ العین نے جہاں خودکشائی کی ایک حد قائم کی ہے وہاں ان بہت سے کرداروں کو بھی اپنے اپنے طاقوں سے اترنے کا موقع کم ہی دیا ہے جن سے ان کی یا ان کے قرابتداروں کی زندگی کے کسی دورانئے میں ایک خاص نسبت رہی ہے۔ سوانحی ناولوں میں بھی تاریخی ناولوں کی طرح Facts جب فکشن کا روپ دھارن کرتے ہیں تو ان کی اصل بڑی حد تک ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔

اس ٹوٹ پھوٹ کی سب سے بڑی وجہ ناول کا وہ فن ہے جس کے اپنے کچھ تکنیکی مطالبے ہوتے ہیں۔ ہر ناول کے ساتھ ان مطالبات کی نوعیت بھی بدلتی رہتی ہے۔ قرۃ العین کا ناول خودگزشت ہونے کے باوجود ایک ضخیم تذکرے کا حکم بھی رکھتا ہے۔ تاریخ، تہذیب اور انسانی رشتوں کی رنگارنگی سے اس کی بافت تیار ہوئی ہے۔ اس بلندکوش ناسٹلجیائی تصویر کی بالائی معنویت کی تہہ میں بغور دیکھا جائے تو کار جہاں کی درازی کے باوجود ناکارگی اور بالآخر لاحاصلی کی ایک زیریں لہر کو بھی ضرور محسوس کیا جا سکتا ہے جسے قرۃ العین کے معروف تصور کی روشنی میں وقت کے جبر کا نام دیا جاتا ہے۔ اس جبر نے گیان سنگھ شاطر کے یہاں سماجی جبر کی شکل اختیار کر لی ہے جو کہیں کہیں نفسیاتی جبر میں بھی بدل جاتا ہے۔ شاطر کے یہاں ناسٹلجیا کی وہ کیفیت نہیں ہے جس میں کسی بیش قیمت ساعت کے کھو جانے کا تاسف پنہاں ہوتا ہے یا یہ خیال کہ یہ جو اتنا برا ہوا نہ ہوا ہوتا تو زیادہ اچھا ہوتا۔ شاطر نے

Glorify کرنے کے بجائے چیزوں کو ان کی 'جو ہے اسی صورت میں' بیان کرنے پر ترجیح دی ہے۔ نفسیاتی ادراک نے شاطر کے تجزیوں کو زیادہ دلچسپ، گرہ گیر اور معنی افزا بنا دیا ہے۔

ندا فاضلی نے اپنے سوانح کے لئے ضمیر متکلم کا سہارا نہیں لیا ہے جو بالعموم خودگزشت ناول نگاروں کا سب سے مرغوب صیغہ کہلاتا ہے۔ اس ترجیح کی پشت پر ان کا یہ منشا بھی ہوسکتا ہے کہ کہیں 'میں' کی پرداخت انا، اظہار، احتساب اور اعتراف کی راہ میں حائل نہ ہو جائے اور وہ معروضیت ہی پیدا نہ ہو سکے جو جرأتوں کو بحال رکھنے کا ایک بڑا سبب بھی ہوتی ہے۔ ندا اپنی شاعری میں مختصر لمحوں کا شاعر ہے یعنی وقت کو وسیع بساط پر پھیلانے سے اسے کوئی خاص رغبت نہیں ہے۔ جب کہ دیواروں کے بیچ اور دیواروں کے باہر کا زمان کم و بیش ۶۰/ برسوں پر محیط ہے۔ ندا کے یہ ۶۰/ برس کسی ایسے شخص کے ۶۰/ برسوں کا عرصۂ رواں نہیں ہیں جسے اپنے ماضی پر گھمنڈ ہو، حال پر فخر اور مستقبل پر اعتماد۔ جو اخلاقیات کی نام نہاد فرہنگ کی ہر اس برائی سے اپنے پاک ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہو اور نہ ہی برائی کے تصور کو اتنا برا خیال کرتا ہے۔ وہ شخص جس نے اپنی تقریباً تمام عمر تن بہ تنہا گزاری ہو۔ اس کے لئے انسانی اور جذباتی رشتوں کی بڑی اہمیت ہو جاتی ہے یا وہ اس قسم کے جذبوں سے عاری ہوکر انتہائی خودغرض، بے حس اور سخت دل بھی واقع ہوسکتا ہے لیکن ندا ایک ایسا کردار ہے جس نے اپنے اکیلے پن کو ٹوٹے پھوٹے اور وقت کے ہارے ہوئے یا حالات سے جوجھتے ہوئے انسانوں کے دکھ دردوں سے آباد کر لیا ہے۔ ماضی کی بازیافت اس کا مسئلہ نہیں ہے اور نہ ہی ماضی اس کے لئے کسی تفاخر کا سامان مہیا کرتا ہے۔ ماضی جیسا ہے اور جو کچھ ہے اس حالت میں اس کے ذہن نشین بھی ہے وہ نہ تو اپنی اس بداعمالی پر پشیمان ہوتا ہے جسے سیدھے سادے لفظوں میں ہم گناہ سے تعبیر کرتے ہیں اور نہ اپنے والد کی اس بے راہ روی پر کوئی لعن طعن کرتا ہے جو اس کی رفیق و شفیق ماں کی حق تلفی، تنہا بسری اور فنا فی الاولاد کا باعث بنتی ہے۔ ندا کے اس شعار پر حافظ کا یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے:

فاش می گویم و از گفتۂ خود دلشادم
بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم

ندا نے ایک غیر از خود ہستی کے طور پر اپنا کردار خلق کر کے خودگزشت کو ناول کے فارم کے قریب تر کر دیا ہے۔ غیر از خود ہستی کے طور پر ندا کا کردار زیادہ جاندار، زیادہ دلچسپ اور زیادہ حرکی

ہے۔اس کا 'میں' اس کی ذہن وضمیر کی آزاریوں اور زندگی کو اس کی تلچھٹ تک پی جانے کی راہ میں نہ تو کہیں مانع آتا ہے اور نہ کہیں قدغن لگاتا ہے۔ایک بوہیمین اسپرٹ ہے جو بچپن سے لے کر پکی ہوئی عمر تک اس کی رگ و پے میں رواں دواں رہتی ہے۔ 'میں' کے بجائے 'ماں' اس کے لاشور کے نہاں خانوں میں جاگزیں ہے جسے وہ زندگی کے کسی موڑ پر بھی چھٹ نہیں پاتا کیونکہ یہ احساس ہمیشہ ایک خون میں تر بہ تر زخم کی طرح اس کے وجود میں جھپکتا رہتا ہے کہ وہ جمیل فاطمہ (ماں کا نام) کے خوابوں کی تعبیر نہیں بن سکا۔اس قلق اور اس تاسف کے علاوہ ایک احساس زیاں اور تھا جو فطرت سے دوری کے باعث اس کی روح کی تھاہ میں بیٹھ جاتا ہے۔پیڑ، پھول اور پودے اکثر اس کے لئے انسانی ذلالتوں، کمینگیوں، مکاریوں، غرض مندیوں، نفرتوں اور ریاکاریوں سے بھری ہوئی دنیا سے تھوڑی دیر کے لئے فراغت کا سامان بھی مہیا کرتے ہیں۔ویسے ندا کے کردار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ انسان سے کبھی مایوس نہیں ہوتا اور نہ انسانوں سے وہ بہت زیادہ توقع باندھتا ہے کہ نفرت یا کمینگی سچویشنل ہوتی ہے۔ سچویشن بدلنے کے ساتھ اس کے رُخ اور اس کے معنی بھی بدل جاتے ہیں۔

'دیواروں کے بیچ' کا ندا اتنا دیواروں کے بیچ نہیں ہے۔وہ ایک آزاد رَو اور آوارہ پنچھی ہے۔ اقرار کے بجائے انکار اس کی شخصیت کا وہ رخ متعین کرتا ہے جسے ہر چیز بے وقعت نظر آتی ہے اور ہر چیز میں تحلیل ہونے کے درپئے بھی دکھائی دیتا ہے۔ حیات و کائنات کی ابسرڈٹی کا عرفان اسے اپنے لڑکپن میں ہوجاتا ہے۔اس لئے رشتوں کے معنی بھی اس کے یہاں کچھ اور مفہوم اختیار کرتے جاتے ہیں۔ وہ پانے کے لئے کھوتا نہیں ہے بلکہ کھونے اور پانے کے احساس ہی سے اپنی ذات کو پرے رکھ کر دنیا کا ایک ایسے تماشہ بین کے طور پر مشاہدہ کرتا ہے جو وجودی اور جسمانی سطح پر اس میں پوری طرح شامل بھی ہے اور روحانی اور ذہنی سطح پر اس سے علیٰحدہ بھی۔جسمانی سطح پر جو اس کے تئیں ایک مستقل سپردگی، زندگی کے ایسے بہت سے نئے معنی اسے بے پروا کردیتے ہیں جنہیں انکشاف کا نام دیا جاسکتا ہے

ساقی فاروقی

'پاپ بیتی' ہو یا ان کی دوسری تخلیقات، ایسا ممکن ہی نہیں تھا کہ ساقی فاروقی کچھ لکھیں اور عالمی پیمانے پر سرخیوں میں نہ آئیں۔ اردو ادب میں شاید ہی کوئی ان سا ہو جس نے اپنی ہر تخلیق پر خوب پذیرائی حاصل نہ کی ہو ادارہ 'نیا دور' جولائی ۲۰۱۸ء کا شمارہ ان کے نام معنون کرنے کا اعلان کرتا ہے۔

اور یہی معنی ندا کے حق میں روحانی اور ذہنی سطح پر ذات حیات، کائنات، فطرت، مذہب، بدی، جرم، گناہ اور انسانی رشتوں کی ایک نئی فرہنگ کے موجب بن جاتے ہیں۔

'دیواروں کے بیچ' اور 'دیواروں سے باہر' کے بعض کردار بہت کم عرصہ کے لئے نمودار ہوتے ہیں لیکن ان میں کوئی ایک ایسا پہلو ضرور ہوتا ہے جو ان کے غیاب میں چلے جانے کے بعد بھی دیر تک ذہن میں گشت کرتا رہتا ہے۔اس کی کوئی لغزش اس کا کوئی عیب، اس کا کوئی فریب ہمیں یاد نہیں رہتا، یاد رہتی ہے اس کی وہ شخصیت جو خوابوں سے لدھی پھندی مگر شکستوں سے چور ہے۔ ہر آدھے ادھورے، ٹوٹے پھوٹے، غریب الوطن میں ندا کو اپنی خانہ خرابی کی کوئی جھلک دکھائی دیتی ہے اور کچھ وقتوں کے لئے وہ اس کی رفاقتوں میں اپنے آپ کو گم کردیتا ہے۔انسانی دردمندی کا یہ وہ درس ہے جو اس کی آوارگیوں کے سب سے پہلے شریک بیر سنگھ سے اسے ملا ہے۔جو خود مصیبت کا شکار ہے لیکن اپنی بیوی شیلا کے ہاتھ ندا کو فیس کی رقم مہیا کرنا نہیں بھولتا۔ یہ سبق اسے اس پنجابی شرنارتھی سے بھی ملا ہے جو لٹا پٹا ہندو ہونے کے باوجود جمیل کی تجہیز و تکفین کے لئے امداد کے طور پر سب سے زیادہ چندہ دیتا ہے۔وہ مندر کا پجاری اسے انس اور دلجوئی کے معنی سکھاتا ہے جو ندا کو اس کے بچپن میں راؤ آواز دے کر بلاتا ہے اور ایک تازہ گلاب کا پھول مورتی سے اٹھا کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیتا ہے۔اسکول کے ساتھ الطاف کی صحبتوں سے اسے جسم اور جنس کی رغبتوں اور تقاضوں کا علم ہوتا ہے۔مس ٹنڈن کی حادثاتی موت اس کے اندر ایک خالی درز سی چھوڑ دیتی ہے۔کچھ دنوں کے لئے عشرت اس خالی درز کو پُر ضرور کردیتی ہے لیکن زندگی بڑی ظالم چیز ہے جس کے مطالبے جنس وجسم کے مطالبوں کو پیچھے کی طرف ڈھکیل دیتے ہیں۔عشرت اس کی پہلی اور آخری محبت ہے۔باقی تمام جنسی اور جسمانی رشتے عشرت کے انتظار کے دورانئے کی خالی جگہ کو بھرتے رہتے ہیں۔وہ ٹھرّا پئے یا انگریزی شراب، جھوٹ بولے یا امانت میں خیانت کرے، چوری کرے یا جھگی جھونپڑی کے آلودہ ماحول میں بسر کرے۔ بیدی

اس پر ترس کھا کر پاگل کا رول آفر کریں یا جنس وجسم کی ترغیبات اسے الجھائے رکھیں۔ وہ کہیں کچھ چھپاتا نہیں ہے۔ ندا کے کردار کا یہی پہلو بیحد جیونت اور متاثر کن ہے۔

وطن کی تقسیم ہوجاتی ہے، آبادی اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر اُلٹ پلٹ جاتی ہے۔ کوئی کہیں رہ جاتا ہے کوئی کہیں۔ گھر کا آرام غارت ہوجاتا ہے۔ مستقبل کے سارے خواب ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ برسوں کی جمی جمائی گرہستی آناً فاناً میں تہس نہس ہوجاتی ہے۔ محل چھپر کھٹ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ضرورتیں، اخلاق کے معنی بدل دیتی ہیں۔ کنواریوں کی گودیں بھر جاتی ہیں اور بوڑھے قبروں کی راہ لیتے ہیں۔ اس اثنا میں ندا کے خاندان کو بھی بے گھری کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ بھوپال ایک عارضی قیامگاہ کے طور پر درمیان میں آتا ہے۔ بھوپال کے بعد ندا عین وقت پر گھر سے بھاگ جاتا ہے اور باقی تمام گھر کے افراد پاکستان کی راہ لیتے ہیں۔ ندا کے لئے دہلی، بھوپال اور گوالیار کا دشت امکاں ایک نقشِ پا ثابت ہوتا ہے اور وہ تمنا کے دوسرے قدم کے طور پر عروس البلاد بمبئی کی راہ لیتا ہے۔

بمبئی میں عزیز جاوید، تاباں جھانسوی، گوالیار کا پپو (قصائی کا بیٹا)، حسن نعیم، پانڈو مانس مکھرجی پیٹر، مارگریٹ ایسے کردار ہیں جنہیں خود بھی یہ احساس نہیں ہے کہ ان کے اقدام یا اقدامات کی پشت پر کون ساجبر کام کر رہا ہے۔ ارادے جہاں باندھے جاتے ہیں اس کا ایک سیاق ہوتا ہے، ارادے جہاں ٹوٹتے ہیں اس کا ایکدوسرا سیاق ہوتا ہے۔ ایک خواب ہوتا ہے، دوسرا تعبیر، خواب میں بسر کرنا سہل ہوتا ہے لیکن تعبیر کی سرزمین بہت سخت ہوتی ہے اور بڑی بے رحم بھی۔ سردار جعفری، اختر الایمان، ساحر لدھانیوی یا مجروح سلطانپوری کی بے گھری ان کا کچھ بگاڑ نہیں پائی۔ ان کے پیروں تلے زمین کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی زمین ملتی رہی۔

اسی لئے یہ کردار محض ٹائپ کے طور پر ہی ابھرتے ہیں۔ جیسا ان کے بارے میں ہم جانتے ہیں، وہ ویسے ہی ہیں۔ عصمت میں ایک انفراد ہے جو مکر یا تصنع سے خالی ہے لیکن انہیں بھی شورِ شکم سے واسطہ پڑتا ہے نہ پیروں تلے کی دھول چاٹنی پڑتی ہے۔

ندا کا کردار عمر کے ہر باب میں تبدیلیوں سے گزرتا ہے۔ جس سیاست نے اسے گھر والوں سے دور کر دیا تھا، وہ اس سیاست سے ضرور نالاں ہے اور اپنے آپ سے بھی وہ اکثر خفا رہتا ہے کیونکہ وہ خود یہ سمجھ نہیں پاتا کہ آخر وہ کیا ہے اور وہ کیا ہے اور کیا چاہتا ہے۔ کبھی خود کو دنیادار سمجھتا ہے۔ کبھی خود پر جھلاتا ہے، کبھی محفلوں میں تنہا ہوجاتا ہے اور کبھی تنہائی کو انجمن سے آراستہ کر دیتا ہے۔ اس انجمن سازی میں کبھی نیم اور پیپل کبھی املی اور مولسری کے درخت اس کے دمساز بن جاتے ہیں۔

❑❑❑

گابرئیل گارسیا مارکیز؛ ایک لافانی ادیب کا شاہکار ناول 'تنہائی کے سو سال'

بیسویں صدی کے محیر العقول تخلیق کار 'گارسیا گابرئیل مارکیز' کے شاہکار ناول 'تنہائی کے سو سال' کو شائع ہوئے پچاس برس پورے ہوگئے۔ اسی ناول پر انہیں ۱۹۸۲ء میں ادب کے نوبل انعام سے نوازا گیا۔ اسپینش زبان میں مارکیز کو خدا کے بعد سب سے بڑا تخلیق کار تصور کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بائبل کے بعد سب سے زیادہ انہیں کی کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔ 'تنہائی کے سو سال' کے ۳۰ سے زیادہ زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔

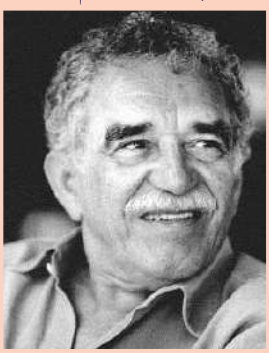

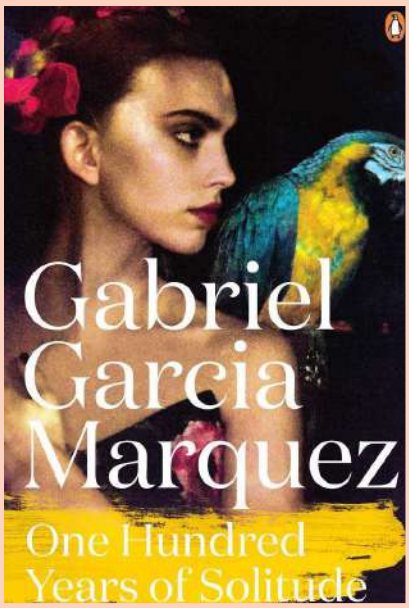

مشہور چیک ناول نگار 'میلان کندیرا' کا کہنا ہے جب 'تنہائی کے سو سال' کے جیسا ناول موجود ہے تو ناول کی موت کا اعلان کرنا محض لغویت ہوگا۔ ۱۹۷۰ء میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے 'ولیم کنیڈی' نے نیشنل آبزرور میں لکھا تھا کہ Book of Genesis کے بعد یہ پہلا ادبی شاہکار ہے جسے تمام نسل انسانی کو پڑھنا چاہئے۔

گابرئیل گارسیا مارکیز کی بیشتر تصنیفات کا دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمے شائع ہوکر مقبول ہو چکے ہیں۔ عالمی ادب کی اس عظیم شخصیت کی تحریروں کو دنیا بھر میں ابھی بھی بڑے ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے۔ مارکیز کی چوتھی برسی پر انہیں بطور خراج اپریل ۲۰۱۸ء کے 'نیادور' میں ان کے افسانوی فن پاروں پر دورِ حاضر کے معروف ادیب، نقاد اور محقق جناب **شمس الرحمن فاروقی** اور مغربی ادب کے رمز شناس، مشہور ناول نگار **خالد جاوید** کے علاوہ ہندی ادیب **پربھات رنجن** کے مضامین بھی شامل ہوں گے۔ اس کے علاوہ مارکیز کے شہرہ آفاق ناول 'تنہائی کے سو سال' کے اقتباسات کا ترجمہ بھی شائع کیا جائے گا۔

ندا فاضلی اپنی منفرد شاعری کے عصری سیاق و سباق کے تناظر میں

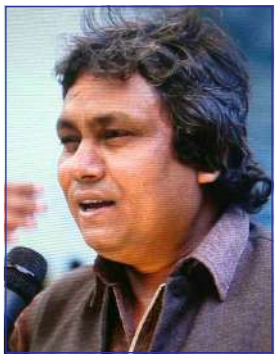

شکیل اعظمی

جدید شاعر، بالی ووڈ کے نغمہ نگار

چھ مجموعۂ کلام شائع، مختلف

انعامات واعزازات سے سرفراز

ملک وبیرون ملک کے مشاعروں

مسلسل شمولیت، وطن اعظم گڑھ

A201، ملوانی رام کرشنا

پلاٹ ۵۲، مہادا کا مپلیکس

ملوانی ملاڈ، ویسٹ، ممبئی

رابطہ: 9820277932

ندا فاضلی کا پورا خاندان گوالیار سے پاکستان ہجرت کرنے کو تیار تھا۔ فیصلہ ہو چکا تھا۔ بڑوں کے اس فیصلے میں ندا کو بھی شریک ہونا چاہئے تھا کیونکہ بٹوارے کے وقت ندا فاضلی لڑکپن کی عمر میں تھے۔ یہ عمر شرارت کی تو ہوسکتی ہے فیصلے کی نہیں ہوتی۔ فیصلہ سنجیدگی چاہتا ہے اور سنجیدگی آتے آتے آتی ہے لیکن ندا فاضلی نے اس فیصلے سے انکار کرتے ہوئے پاکستان نہ جانے کا اعلان کیا۔ یہ ندا فاضلی کے غیر معمولی ہونے کا پہلا ثبوت تھا۔ وہ گھر سے بھاگ گئے اور دور دور کہیں چھپ کر اپنی ہی جڑوں کو خود سے کٹنے کا دردناک منظر دیکھتے رہے۔ بھرا پورا گھر ویران ہو گیا۔ طوفان گزر جانے کے بعد ندا فاضلی اس خالی مکان میں واپس آئے۔ وہ اکیلے تھے، وہ چپ تھے۔ اپنے خالی مکان کی طرح۔ کچھ دیر تک ان کی چپ اور خالی مکان کی خاموشی آپس میں گفتگو کرتی رہی پھر نہ جانے کون سی بات پر دونوں لڑ پڑیں۔ چپ اور خاموشی میں جھگڑا اس قدر بڑھ گیا کہ ندا فاضلی گھر کی خاموشی کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر اپنی چپ کے ساتھ بنجارہ ہو گئے۔ ان کا یہ بنجارہ پن گوالیار سے دہلی اور ہندوستان کے مختلف شہروں کی خاک چھانتے ہوئے ایک دن بمبئی پہنچا۔ وقت نے ندا فاضلی سے ان کا سب کچھ چھین لیا تھا۔ لیکن وہ سب کچھ 'کھویا ہوا سا کچھ' بن کر ان کے ذہن میں ہمیشہ محفوظ رہا۔

ندا فاضلی جس دور میں بمبئی آئے۔ اس دور میں ادب، صحافت، مشاعرہ اور فلم تک قلم کے جتنے کاروباری یا نیم کاروباری پلیٹ فارم تھے، سب پر ترقی پسند قلمکاروں کا قبضہ تھا۔ ندا فاضلی نے اپنی شاعرانہ تازہ کاری، گفتگو کی جرأتمندانہ بیباکی اور رات میں محفل رندانہ کی محفل بازی سے ان قلمکاروں کو نہ صرف یہ کہ بہت جلد متوجہ کر لیا بلکہ رازدارانہ طور پر انہیں اپنے اوپر کھول بھی لیا۔ ندا پر بمبئی کے بڑے قلمکاروں کا یہی کھلا پن ان کی کتاب 'ملاقاتیں' کا مواد بھی بنا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت نے ندا کو ادب میں راتوں رات مشہور کر دیا تھا لیکن انہیں ان قلمکاروں کی ناراضگی بھی مول لینی پڑی تھی۔ اس کے باوجود اختر الایمان، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، جانثار اختر اور خصوصاً ساحر لدھیانوی نے کئی بار ندا کی مدد کی۔ علی سردار جعفری نے اپنے رسالہ 'گفتگو' میں انہیں کام دیا۔ شام کی شراب اور رات کے کھانے کے لئے وہ اکثر ساحر کے بنگلے پر جایا کرتے تھے۔ بدلے میں انہیں ساحر کی شاعری سننی پڑتی تھی اور واہ واہ کرنی پڑتی تھی۔

شراب کے نشے میں ایک مرتبہ انہوں نے ساحر کی شاعری پر کمنٹ کر دیا۔ کمنٹ نے بحث کی شکل اختیار کر لی۔

اس رات ساحر نے ندا کو کھلائے بغیر ہی گھر سے نکال دیا تھا البتہ ندا کی جیب میں کچھ روپئے ضرور ڈال دئے تھے۔ ساحر کی اس ادا کو میں ان کی انسانی دردمندی سے تعبیر کرتا ہوں۔ وہ رات دوسری راتوں کی طرح گزر گئی لیکن ساحر کی ناراضگی برقرار رہی جس کا اظہار انہوں نے تب کیا جب ندا فاضلی نے میوزک ڈائرکٹر آر ڈی برمن کے ساتھ کسی فلم کے لئے ایک گیت لکھا۔ گیت فائنل بھی ہو گیا لیکن ساحر نے پروڈیوسر پر اپنا دباؤ ڈال کر ندا کو فلم سے باہر کر دیا۔ آر ڈی برمن نے ندا کو اسٹوڈیو بلا کر معذرت کی اور انہیں اپنی طرف سے کچھ روپئے بھی دئے۔

ساحر نے اس ناراضگی کا اظہار تب بھی کیا جب فلم رائٹر ایسوسی ایشن کی جانب سے ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا جس کی صدارت ساحر لدھیانوی فرما رہے تھے۔ ساحر نے اپنی پوزیشن کا استعمال کرتے ہوئے ایسوسی ایشن کو کہا کہ اگر ندا کو بلا رہے ہو تو میں نہیں آؤں گا اور پھر ندا کو مشاعرے کی فہرست سے کاٹ دیا گیا۔

وقت بھی پاکستان بن کر، کبھی ساحر لدھانوی بن کر اور کبھی دیگر ناموں اور چہروں میں تبدیل ہو کر ندا سے کچھ نہ کچھ چھینتا رہا۔ ایک بار یہی وقت کتے کا روپ دھارن کر کے ندا کے پیٹ پر لات مارنے تب آیا جب ندا چمبور کی جھونپڑ پٹی میں قصائی کی دکان سے گوشت کی چند بوٹیاں خرید کر اپنی کھولی میں داخل ہو رہے تھے۔ وقت نے بھونک کر ندا فاضلی کو ڈرایا اور گوشت کی تھیلی چھین کر چمپت ہو گیا۔

ندا نے اس بار وقت کا پیچھا کیا۔ وہ اس دن اتنی تیز دوڑے کہ وقت سے آگے نکل گئے۔ انہوں نے خود سے چھینا ہوا گوشت وقت سے دوبارہ حاصل کیا اور اسے پکا کر کھایا بھی۔ اس جیت کے بعد انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ کامیابی کی طرف بڑھنے لگے۔ ندا فاضلی کے ہمدردوں میں باقر مہدی، زبیر رضوی، سید عارف اور جے پرکاش چوکسے بھی تھے۔ ندا نے جب مشاعرہ کو پیشہ بنایا تو زبیر رضوی ان سے سینئر تھے اور اپنی عوامی شاعری اور مترنم آواز کے سبب مشاعروں میں کافی مقبول تھے۔ مشاعرے کا کامیاب شاعر مشاعرے کی فہرست میں دخل اندازی کا پورا حق رکھتا ہے۔ زبیر رضوی اپنے اس حق کا استعمال ندا فاضلی کے لئے کرتے تھے۔ جے پرکاش چوکسے ہندی کے بڑے صحافی اور فلم پروڈیوسر اور فلم ڈسٹری بیوٹر تھے۔ ہندی اخباروں میں لکھنے کا چسکہ ندا کو انہوں نے ہی لگایا تھا۔

فلم ڈسٹری بیوٹر اور صحافی ہونے کی وجہ سے راج کپور سے مہیش بھٹ تک جے پرکاش چوکسے کے ہر بڑے فلم پروڈکشن سے قریبی تعلقات تھے۔ ندا نے مہیش بھٹ کے ساتھ فلم 'تمنا' اور 'چاہت' میں گانے لکھے۔ کمال امروہوی اور راج کپور کے ساتھ بھی انہوں نے کام کیا۔ جے پرکاش چوکسے نے اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی حیثیت سے بھی راج کپور کے یہاں انہیں کام دلایا لیکن ندا نے مشاعروں کے چکر میں یہ کام چھوڑ دیا۔ ندا زندگی بھر مشاعروں پر لعنت بھیجتے رہے اور مشاعروں سے جڑے بھی رہے کیونکہ مشاعرہ فوری طور پر پیسے دیتا ہے جس سے ضروریات زندگی کی تکمیل ہوتی ہے۔

امرا پارٹمنٹ، کھار والا فلیٹ بھی ندا نے جے پرکاش چوکسے کے تعاون اور ان کے اصرار پر لیا تھا۔ جس طرح نغمہ نگار آنند بخشی نے میوزک ڈائرکٹر لکشمی کانت پیارے لال کے ساتھ جوڑی بنائی تھی لیکن اس جوڑی کو خاطر خواہ کام نہیں ملا۔ ندا نے میوزک ڈائرکٹر اوشا کھنہ، آر ڈی برمن اور خیام وغیرہ کے ساتھ کئی کامیاب نغمے تحریر کئے۔ جتن للت اور اسماعیل دربار کے ساتھ بھی انہوں نے کام کیا۔ فلم وہ 'وہ تیرا نام تھا' میں انہوں نے دلیپ سین، سمیر سین اور روپ کمار راٹھور کے ساتھ کام کیا تھا۔ اس فلم کے پروڈیوسر ریمنڈ کے مالک وجے پتھ سنگھانیہ اور ڈائرکٹر کوئی کوہلی تھے۔ ندا فاضلی اور قتیل شفائی وغیرہ کے ساتھ اس فلم کے لئے میں نے بھی دو گیت تحریر کئے تھے۔ یہ میرے کیریئر کی پہلی فلم تھی جو ۲۰۰۴ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

آنند بخشی کے انتقال کے بعد ندا فاضلی کی ایک فلم سبھاش گھئی کے ساتھ شروع ہوئی تھی جس کے لئے میوزک ڈائرکٹر اے آر رحمان نے ان کے تین نغمے صدا بند بھی کر لئے تھے۔ اس فلم میں دلیپ کمار، امیتابھ بچن اور شاہ رخ خاں ایک ساتھ کاسٹ کئے گئے تھے لیکن یہ فلم چند وجوہات کی بنا پر اپنے شروعاتی دور میں ہی بند ہو گئی۔ آخری دنوں میں ان کی قابل ذکر فلمیں، 'سُر' اور 'دیو' تھیں۔ ڈائرکٹر گووند نہلانی اور اسٹار کاسٹ بڑی ہونے کے باوجود 'دیو' کے گانے نہیں چلے۔ 'سُر' میں انہوں نے ایم ایم کریم کے ساتھ کام کیا تھا۔ 'سُر' کے گانے بیحد مقبول ہوئے۔ اس فلم کے گانوں کے لئے انہیں اسکرین ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ 'سُر' کے گیتوں کے علاوہ 'تو اس طرح سے مری زندگی میں شامل ہے'، 'کبھی کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا'، 'ہوش والوں کو خبر کیا زندگی کیا چیز ہے'، 'اجنبی کون ہو تم'، 'ترا ہجر مرا نصیب ہے'، 'تمہاری آنکھوں کی چلمنوں میں'، 'تیرے لئے پلکوں کی چھاؤں بنوں' وغیرہ ان کے کامیاب ترین اور سدا بہار گانے ہیں۔ ندا فاضلی کی کامیابی کا ایک اہم حصہ ندا فاضلی اور جگجیت سنگھ کی جوڑی تھی۔ جگجیت سنگھ نے ندا کی غزلیں ہی نہیں ان کے دوہے بھی رکارڈ کئے۔ ان کی نظموں کا بھی البم بنایا۔ جگجیت سنگھ کی آواز میں ندا کی کئی غزلیں فلم کے گانوں کی طرح مقبول ہیں۔ مالی تعاون کے لئے جگجیت سنگھ ندا فاضلی سے

اپنے پروگرام کی نظامت بھی کرواتے تھے۔ دوستی کا یہ رشتہ دونوں کے درمیان آخری دنوں تک قائم رہا۔ جس تاریخ کو ندا فاضلی کا انتقال ہوا۔ وہ جگجیت سنگھ کی پیدائش کی تاریخ تھی۔

ندا فاضلی گوالیار کی ایک لڑکی عشرت سے عشق کرتے تھے۔ عشرت ندا کو گوالیار لے جانے کے لئے بمبئی آئی لیکن ندا نے بمبئی نہیں چھوڑا۔ نتیجتاً عشرت انہیں چھوڑ کر گوالیار واپس چلی گئی۔ انہیں دنوں راج کوٹ کی ایک گجراتی برہمن لڑکی مالتی جوشی نے ان کی زندگی میں قدم رکھا۔ مالتی جوشی تھیٹر کی ایکٹریس اور غزل سنگر بھی تھیں۔ وہ ایکٹنگ کے لئے فلموں میں بھی جدوجہد کر رہی تھیں۔ اسٹرگل کے دوران کسی فلم کے توسط سے دونوں کی ملاقات ہوئی اور یہ ملاقات دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ انہی دنوں ندا فاضلی بیمار ہوئے، ہاسپٹل میں داخل ہونا پڑا۔ مالتی نے ایسے وقت میں انہیں بہت سنبھالا اور دونوں ہمیشہ کے لئے ایک ہوگئے۔ مالتی سے ان کی ایک بیٹی ہے جس کا نام تحریر ہے۔ تحریر کے لئے انہوں نے دو نظمیں لکھیں اور ایک غزل بھی۔ غزل کے چند اشعار یوں ہیں:

جسے دیکھتے ہی خماری لگے
اسے عمر ساری ہماری لگے
وہ سسرال سے آئی ہے مائیکے
اسے جتنا دیکھو وہ پیاری لگے
اجالا سا ہے اس کے چاروں طرف
وہ جادو بدن پاؤں بھاری لگے

آخری شعر کے تصور کو حقیقت میں دیکھنے سے پہلے ہی انہوں نے اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لئے موند لیں۔

ندا فاضلی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۹۴ء میں ہوئی۔ وہ گجرات اردو اکادمی کے ایک مشاعرے کے سلسلہ میں 'سورت' آئے تھے۔ ان دنوں میں سورت ہی میں مقیم تھا۔ یہ بہت بڑا مشاعرہ تھا جس کی صدارت پروفیسر وارث علوی فرما رہے تھے۔

اس مشاعرے میں ندا کے علاوہ محمد علوی، جاوید اختر، افتخار امام صدیقی، شین کاف نظام اور کئی مشاعرہ مار شاعر بھی شامل تھے۔ یہ میرا پہلا بڑا مشاعرہ تھا جس میں میرا نام گجرات اردو اکادمی کے نائب صدر ایڈوکیٹ حکیم کاظم نے دیا تھا۔ فہرست میں مجھ سمیت پانچ چھ مقامی شعراء شامل تھے۔ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے ہی ندا فاضلی، جاوید اختر، محمد علوی اور افتخار امام کے ساتھ گھل مل گیا تھا۔ ندا اور علوی سے ایک ذرا بے تکلفی بھی ہوگئی تھی۔ خیر صاحب، مشاعرہ شروع ہوا اور دو تین مقامی شاعر اس بری طرح سے ہوٹ ہوئے کہ انتظامیہ نے یہ طے کیا کیا کہ اب مقامی شعراء نہیں پڑھائے جائیں گے۔ ندا فاضلی میرے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے حکیم ناظم سے کہا کہ اگر شکیل نہیں پڑھے گا تو میں بھی نہیں پڑھوں گا۔

ان دنوں مشاعروں میں ندا فاضلی کا طوطی بولتا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ حکیم صاحب کو ان کی بات ماننی ہی پڑی لہٰذا مجھے کلام سنانے کے لئے مائک پر بلایا گیا۔ ان دنوں ندا فاضلی اپنی بیوی مالتی جوشی کو مالتی جوزم کے نام سے مشاعروں میں لے جاتے تھے۔ مالتی

اردو زبان کا سیکولر کردار

دوسری زبانوں کے مقابلے اردو میں سیکولرزم کی پختہ روایت پر **پروفیسر مشیر الحسن** کا مضمون

اردو کے مشہور و معروف شاعر **انور جلالپوری** کی شخصیت اور فن پر

مختلف مشاہیر قلم کے تاثرات کے ساتھ ان کے **بھگوت گیتا** کے منظوم ترجمہ کے اقتباسات

اردو ادب میں اتر پردیش کے غیر مسلم ناول نگاروں کی خدمات پر **نعمان قیصر** کا مضمون

فارسی ادب میں ہندو شعراء کی خدمات پر **ڈاکٹر سعدیہ جعفری** کا مضمون

مئی ۲۰۱۸ء کا 'نیا دور' اردو زبان کے انہیں اوصاف پر مبنی ہوگا

جوشی خوبصورت خاتون تھیں۔ کالی ساڑی میں وہ اسٹیج کی زینت اور سامعین کی نگاہ کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ میں نے غزل کا مطلع پڑھا:

کسی بھی کھیت پہ برسے کہیں کا ہو جائے
خدا کرے کہ یہ بادل زمیں کا ہو جائے

مطلع پر داد کم آئی مگر مجھے ہوٹ نہیں کیا گیا۔ غزل کے اگلے دو اشعار میں نے مالتی جوشی کی نذر کردئے:

میں اس کے جسم کا سب زہر پی کے مر جاؤں
اگر وہ سانپ مری آستیں کا ہو جائے
دعا کرو وہ ستارہ زمیں پہ ٹوٹ گرے
ہمارے ساتھ رہے اور یہیں کا ہو جائے

سامعین کی داد سے مشاعرہ الٹ پلٹ ہو گیا۔ مجھ پر بے خودی کا عالم طاری ہو گیا۔ میں بے خبری میں جیسے ناچنے لگا۔ اس طرح کے اشعار ندا فاضلی کی بیوی سے منسوب کرکے پڑھنا بڑی جرأت کی بات تھی اور میں یہ جرأت کر چکا تھا۔ ندا فاضلی ناراض بھی ہو سکتے تھے لیکن انہوں نے گل پوشی کرکے میری حوصلہ افزائی کی۔

مشاعرے کے بعد سرکٹ ہاؤس میں شراب کے ساتھ میری شاعری کی محفل سجی جس میں پروفیسر وارث علوی، ندا فاضلی، جاوید اختر، محمد علوی اور افتخار امام صدیقی نے گھنٹوں میری شاعری سنی۔

اس مشاعرے کے بعد میں ندا سے ملنے بمبئی آیا۔ ان دنوں میں اپنی پہلی کتاب 'دھوپ دریا' ترتیب دے رہا تھا اور مجھے اپنی شاعری کے حوالے سے ندا کے چند تعریفی جملے درکار تھے۔ ندا نے مجھے 'ویسٹرن اسٹوڈیو' بلایا۔ میں وقت پر پہنچ گیا۔ ندا ابھی نہیں آئے تھے۔ ندا کا انتظار کرتے ہوئے میں نے سگریٹ سلگائی لیکن مجھے سگریٹ پینے سے روک دیا گیا۔ جب ندا آ گئے تو میں ان کے ساتھ سنگنگ روم میں گیا۔ جگجیت سنگھ ہارمونیم پر ریاض کر رہے تھے۔ میں نے انہیں پہلی بار اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ پھر میں نے یہ بھی دیکھا کہ جگجیت سنگھ سگریٹ پی رہے تھے۔ میں نے ندا کو بتایا کہ مجھے سگریٹ پینے سے منع کیا گیا اور جگجیت سنگھ سنگنگ روم میں سگریٹ پی رہے ہیں تو انہوں نے کہا وہ جگجیت سنگھ ہے اور تم شکیل اعظمی بھی نہیں ہو۔

ندا فاضلی نے وہیں ایک کاغذ پر میری شاعری کے تعلق سے چند سطریں لکھیں اور میں سورت لوٹ آیا۔ ندا فاضلی کی وہ سطریں میری کتاب 'دھوپ دریا' کے فلیپ پر درج ہیں۔

فروری ۲۰۰۱ء میں میں دوبارہ بمبئی آ گیا اور

ندا سے ملاقاتوں کا سلسلہ مزید بڑھ گیا۔ آخری دنوں میں وہ اپنی ہر تازہ نظم اور غزل فون پر سنایا کرتے تھے۔ ان کی نظم یا غزل سن کر کبھی کبھار میں بطور مشورہ کچھ کہہ دیتا تو وہ مجھے 'چپ بے' کہہ کر خاموش کر دیا کرتے تھے۔ دوسرے دن پھر فون آتا اور وہ بڑی ایمانداری سے کہتے، میں نے وہی رکھ لیا یا ترمیم کر لیا۔ پھر ترمیم شدہ بھی سناتے۔

۸ رفروری کو میری دو فلمی میٹنگیں تھیں۔ ایک انو بھوسنا کے ساتھ دوسری اندر کمار کے ساتھ۔ میں گھر سے جلدی نکل گیا تھا۔ راستے بھر فون آتے رہے لیکن بائک پر پتہ نہیں چلا۔ انو بھوسنا کے دفتر کی بلڈنگ کے نیچے میں نے فون دیکھا تو کئی مسڈ کال تھے۔ یہ سارے فون ندا فاضلی کے انتقال کی خبر کے تھے۔ میں سیدھا ندا فاضلی کے گھر پہنچا۔

وہ چادر اوڑھے اپنے فلیٹ کے ہال میں سو رہے تھے۔ ان کی بیوی اور بیٹی اپنے آنسوؤں کی گرمی سے انہیں جگانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ آنکھیں ایسی تھیں جیسے جاگ رہی ہوں لیکن وہ جگے نہیں۔ چہرہ ایسا تھا جیسے ابھی بول پڑیں گے اور میرے کچھ کہنے پر کہیں گے 'چپ بے' لیکن وہ بولے نہیں۔ کیمرے کے سامنے وہ بہت بولتے تھے لیکن اس وقت کیمرے بھی انہیں نہ بلوا سکے۔ پھر ہم انہیں قبرستان لے گئے، تب بھی وہ نہیں بولے۔ ہم انہیں دیر تک نہلاتے رہے، تب بھی وہ نہیں بولے، یہاں تک کہ ہم نے انہیں قبر میں اتار دیا تب بھی وہ نہیں بولے، قبرستان سے میں دوبارہ ان کے گھر آیا۔ کچھ وقت ان کی بیوی اور بیٹی کے ساتھ گزارا۔ رات میں ڈیڑھ بجے میں اپنے گھر پہنچا۔ بیوی نے کھانا گرم کیا لیکن کھانے کو جی نہیں چاہا۔ بیڈروم میں جا کر لیٹ گیا۔ سونے کی کوشش کی۔ جب بھی آنکھ بند کرتا ان کے چہرہ سامنے آ جاتا۔ یہ سلسلہ رات بھر چلتا رہا۔ میں صبح تک ایک منٹ بھی نہ سو سکا۔ فضا میں فجر کی اذان گونج رہی تھی۔ ان کا چہرہ میرے سامنے تھا۔ میں نے کہا، قبرستان سے واپس کیوں آ گئے۔ ایک طویل خاموشی کے بعد آخر کار وہ بولے، 'چپ بے، میں مرا نہیں ہوں' ایک پل کے لئے میرے ہونٹ جیسے مسکرا اٹھے لیکن میری آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ میں نے اپنے موبائل کا ڈسپلے آن کیا اور ان کا نمبر ہمیشہ کے لئے بلاک کر دیا تاکہ وہ اپنے اس جملے کو ترمیم کرکے مجھے کبھی نہ سنا سکیں۔

❑❑❑

ندا فاضلی کی نثر نگاری کی تفہیم اور قرأت کا ایک خوشگوار تجزیہ

مظہر احمد

محقق ونقاد

سترہ کتابوں کے مصنف ومرتب،

طنز ومزاح خصوصی میدان

بنیادی طور پر شاعر

فی الحال ذاکر حسین کالج، دہلی میں

ایسوسی ایٹ پروفیسر، وطن دہلی

3358، کوچہ جلال بخاری،

بازار دہلی گیٹ، نئی دہلی

رابطہ: 9212089910

خود اظہاریت کے تعلق سے ادب میں کئی اصناف متعارف ہیں جن سے ادیب اپنی شخصیت کے خدو خال کی آمیزش کے ساتھ اپنے احباب کے تعارف اور اپنی زندگی کے اہم واقعات کی عکاسی کر سکتا ہے۔ زبان و بیان کی قید میں رہتے ہوئے ایسی اصناف، تاریخی، سماجی اور معاشرتی صداقتوں کو بھی بروئے کار لاتی ہیں۔ ان اصناف میں خودنوشت سوانح حیات، آپ بیتی، خطوط، ڈائریاں اور یادداشتیں (Memories) شامل ہیں۔ اردو میں اس قبیل کی اصناف میں سب سے زیادہ مقبول صنف خودنوشت سوانح حیات ہے جس کے نعم البدل صنفی نام آپ بیتی اور یادداشتیں ہیں حالانکہ یادداشتوں یعنی Memories کے عنوان سے بھی بہت سے ادیبوں نے اپنی زندگی کی روداد قلم بند کی ہے مگر ان کی تعداد مختصر ہی ہے۔ ایسی ہی چند اہم یادداشتوں میں اردو کے نامور شاعر ندا فاضلی کی یادداشتیں بعنوان 'دیواروں کے بیچ' اور 'دیواروں کے باہر' (دو جلدیں) جو اولاً ماہنامہ شاعر کے صفحات کی زینت بنیں، اپنی صنفی خوبیوں کے ساتھ ساتھ موضوع ومواد کے اسلوب کی وجہ سے توجہ کی حامل ہیں۔

ندا فاضلی کا نام ادب کے قارئین اور مشاعروں کے شوقین حضرات کے لئے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ اردو کے مقبول شعراء کی فہرست میں شامل تھے۔ ان کی سہل ممتنع کی شاعری ہر خاص وعام میں مقبول ہے۔ سلاست زبان کے باوجود انہوں نے زینت کی پیچیدگیوں کو غزل، نظم اور دوہوں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس مختصر مضمون میں ہم ان کی شاعری سے بحث کرنے کے بجائے ان کی نثر نگاری کی اہم خصوصیات کا تذکرہ کریں گے۔ ندا فاضلی اپنی شخصیت کی سادگی کے لئے بھی مشہور ہیں اور یہی سادگی وسلاست ان کے ادب کا حصہ ہے۔ مذکورہ بالا دو کتابیں میدان نثر میں انہیں دوام بخشنے کے لئے کافی ہیں مگر ذرا ٹھہریئے۔ یہاں ان کے دو دیگر مضامین کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ ماضی بعید یعنی ۱۹۶۶ء اور اس کے دس سال بعد یعنی ۱۹۷۶ء میں انہوں نے دو رپورتاژ بعنوان 'بمبئی سے اودے پور تک' اور 'جشن شاعر' تحریر کئے تھے۔ جو ماہنامہ 'شاعر' کی ہی زینت بنے تھے۔ یہ رپورتاژ اپنی شگفتگی وشائستگی کے ساتھ ساتھ رواں دواں اور بے تکلف اسلوب کے پروردہ تھے۔ ان رپورتاژوں میں انہوں نے بطور خاص صیغۂ حاضر کا التزام کیا تھا جس کی وجہ سے حقیقی واقعات کی کمنٹری کے انداز میں ان میں در آیا تھا جو کہ رپورتاژ کے لئے بڑی حد تک لازمی سمجھا جاتا ہے۔

چنانچہ ان رپورتاژوں کی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ یہاں ان کے تذکرے کی ایک خاص وجہ ہے اور وہ یہ کہ ندا فاضلی نے اپنی یادداشتوں کو اسی اسلوب میں تحریر کیا ہے جس کا تذکرہ ان کے رپورتاژوں کے سلسلہ میں کیا گیا یعنی یہاں صیغۂ حاضر کے التزام کے ساتھ ساتھ ندا فاضلی نے خود کو غیر تصور کر کے اپنی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات کو ایک نئے اور اچھوتے اسلوب میں قلم بند کیا ہے جسے کسی حد تک رپورتاژی اسلوب کہا جا سکتا ہے۔ خود نوشت تحریر کرنے کے لئے یہ اسلوب نہ ماضی میں عام تھا نہ ندا فاضلی کے بعد ہی اس کی تقلید کی گئی ہے۔ یاں رپورتاژوں میں اس نوع کے نمونے اکثر نظر آتے ہیں مگر یاد رکھئے کہ رپورتاژ نگاری پر اب ایک قسم کا زوال سا آ گیا ہے اور جمود کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ علاوہ ازایں مرزا غالبؔ نے بھی اپنے خطوط میں خود کو غیر تصور کر کے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں۔ آیئے ندا فاضلی کے اس مخصوص اسلوب کے چند نمونے دیکھیں:

کتاب 'دیواروں کے بیچ' کی ابتدا اس منظر سے ہوتی ہے:

'سورج غروب ہو رہا ہے۔ ایک بیہوش عورت کے گرد تین چار بچے سہمے ڈرے بیٹھے ہیں۔ بڑی بہن اٹھ کر لالٹین کی چمنی صاف کر کے اسے روشن کرتی ہے۔ چاروں طرف چتکبری روشنی پھیل جاتی ہے۔ سامنے املی کے درخت پر ایک ڈراؤنا بھوت روز کی طرح آج بھی آ کر بیٹھ گیا ہے۔ لمبے لمبے دانت، ٹیڑھے ٹیڑھے ہاتھ پاؤں۔ ہوا سے شاخیں ہلتی ہیں تو اس کی گرم سانسیں بہت قریب محسوس ہوتی ہیں۔ دالان سے آنگن میں آتے ہی ڈر لگتا ہے۔'

یہاں شام کے پس منظر میں ایک ڈر کے ساتھ ساتھ اسلوب کی انفرادیت نے اسے حقیقت سے قریب کر دیا ہے۔ تقسیم ہند کے نتیجے میں برپا فرقہ وارانہ فسادات کا ذکر کرتے ہوئے ندا فاضلی اپنے مخصوص انداز میں جس میں صیغۂ حاضر کا اہتمام ملتا ہے، ایک دیگر مقام پر یوں منظر کشی کرتے ہیں:

'صبح کے گیارہ بجے ہیں۔ نومبر کی ابتدا ہے۔ ہواؤں میں خنکی شامل ہو گئی ہے۔ ٹھیلوں پر سفید امرودوں کے ڈھیر سے لگے ہیں۔ املی میں ہرے ہرے طوطے ہری شاخوں میں چھپ کر کچی املی کے کنارے کتر کتر کے نیچے پھینک رہے ہیں۔ محلے کے بچے انہیں چن رہے ہیں۔ بڑی بہن آنگن میں کئی رنگوں کے کٹورے رکھے ایک دوپٹے کو دھنک کی طرح کئی رنگوں سے سجا رہی ہے۔ اچانک کوئی آ کر بتاتا ہے، گلی کے نکڑ پر سلمان رنگریز کی دکان لٹ رہی ہے۔'

ایک اور اقتباس پیش ہے، اس میں منظر نگاری کے ساتھ ساتھ رپورتاژ کے اسلوب نے پردۂ سیمیں پر متحرک تصویریں کھینچ دی ہیں اور ہم مصنف کے ساتھ ساتھ اس منظر کا ایک ناگزیر حصہ بن جاتے ہیں اور یوں درحقیقت یادداشت نویس ہمیں اپنی زندگی میں شامل کر لیتا ہے اور ہم اس کے تخیل کی انگلی تھامے رواں دواں اس کی داستان زیست میں شریک ہو جاتے ہیں:

'پیرا گڑھ کے غیر آباد علاقہ میں بہت دنوں کے بعد چہل پہل ہوئی ہے۔ پیڑ پودوں کی سرسراہٹوں سے گونجتے ہوئے ویران مکانوں کے جنگل میں آدم زاد آہٹیں پھیل رہی ہیں۔ آسمان کی اجلی نیلاہٹیں دھیمے دھیمے ماند پڑتی جا رہی ہیں۔ بادلوں سے چڑیاں، کبوتر اور دیواروں پہ لکھے انجام نام رخصت ہو گئے ہیں اور ان میں مہاجر داخل ہو رہے ہیں۔ کونے کوسوں میں پڑی شراب کی خالی بوتلیں، ٹوٹی ہوئی چوڑیاں، ادھ لکھے کاغذ، میلے کندھوں میں الجھتے ہوئے بال، خاموشی کی زبان میں نئی نئی کہانیاں سنا رہے ہیں لیکن لٹے پٹے لوگوں کے پاس ان کو سننے کی فرصت نہیں ہے۔ سب اپنی اپنی الجھنوں میں الجھے ہوئے ہیں۔'

غرض کہ ایسے ہی غیر معمولی اور انوکھے اسلوب میں ندا فاضلی نے اپنی زندگی کی یادداشتوں کو یکجا کیا ہے۔ اسلوب کی یہ خصوصیت ندا کی تحریر کو دوسروں سے ممتاز بھی کرتی ہے اور عام دلچسپی کا موجب بھی بناتی ہے۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ ماضی میں تحریر کردہ اپنے رپورتاژوں کی کامیابی سے انہیں اس اسلوب میں اپنی خودنوشت لکھنے کی تحریک ملی ہوگی اور یوں ایک منفرد اور انوکھی خودنوشت وجود میں آئی۔

اسلوب بیان کی اس خوبی سے قطع نظر ندا فاضلی کی یادداشتیں قرأت کے ایک خوشگوار تجربے سے قاری کو مسحور کر دیتی ہیں۔ طویل ابواب کے بجائے ندا فاضلی نے مختصر ابواب میں اپنی یادداشتوں کو منقسم کیا ہے۔ حالانکہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ خودنوشت قسطوار ماہنامہ 'شاعر' کے صفحات کی زینت بنی اور ضخامت کی پابندی نے مصنف کو مختصر نویسی پر مجبور کیا مگر یہ مختصر نویسی دوضخیم کتابوں کی صورت میں ڈھل گئی جس سے ندا فاضلی کی زندگی کے نشیب و فراز، خاندانی حالات، تقسیم ہند کے اثرات سے لے کر دوست، احباب، ادبی و فلمی زندگی اور زندگی کے دگرگوں حالات و واقعات بہ تفصیل در آئے۔ انہیں نہ دوسروں کا خوف ہے نہ خود سے محبت۔ چنانچہ حق گوئی و بے باکی ان کی یادداشتوں کی خصوصیت ہے جب کہ خودنوشت نگار اکثر دوسروں کے خوف کے ساتھ خودستائی کے جال میں گرفتار ہو کر حقیقت نگاری کا خون کر دیتے ہیں۔

خودنوشتوں کی اس خامی کی طرف اردو کے ایک جید نقاد سید عبداللہ لکھتے ہیں:

'ارادے سے لکھی گئی آپ بیتی (خودنوشت) ناکام صنف ہے۔اس میں ملمع زیادہ ہوتا ہے اور اظہار کے نام سے اخفا کیا جاتا ہے اور لوگوں کو دھوکا دیا جاتا ہے کہ میں پرلے درجے کا صاف گو اور راست باز ہوں۔'

فرد جج بن کر دوسروں کا احتساب کر سکتا ہے اور اکثر کرتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے اکثر غلط نتائج بھی اخذ کر لیتا ہے مگر خود احتسابی مشکل امر ہے۔خود کو کٹہرے میں کھڑا کرنا اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا نہایت مشکل کام ہے اور جو اس فصل میں کامیاب ہو جاتے ہیں ان کی یادداشتیں خاصے کی چیز بن جاتی ہیں۔

ندا فاضلی اکثر خود احتسابی کی منزل سے گزرے ہیں۔ انہوں نے راست گوئی میں اپنی شخصیت کی کجی اور خامیوں پر بھی نظر ڈالی ہے اور اپنے احباب کو بھی تنقید میں آزمایا ہے۔ندا کی نثر نگاری میں صداقت کے جگنو جا بجا چمک رہے ہیں۔حقیقت نگاری کی ادائیگی کے سلسلہ میں ندا فاضلی لڑکپن کی جنسی بے راہ روی اور سماج میں پھیلی ہم جنس پرستی پر بھی بے باکی سے اظہار خیال کرتے ہیں:

'اک نئی دنیا اس کے سامنے پھیل رہی ہے۔حیرت و لذت کے انوکھے رنگوں سے رنگی ہوئی۔ یہ دنیا اعصاب میں چکا چوند پیدا کر رہی ہے۔اس انکشاف نے اس کی چال ڈھال اور بول چال میں تبدیلی پیدا کر دی ہے۔لڑکیوں کے جسم روپوش خزانے بن گئے ہیں جن میں سونا چاندی، ہیرے موتی، نہ جانے کیا کیا بھرے ہوئے ہیں۔ رات دن ان دیکھی دولتوں کے سراغ لگائے جاتے ہیں۔ پتے ٹھکانے معلوم کئے جاتے ہیں اور اسی تگ و دو میں صبح سے شام ہوتی رہتی ہے۔'

بزرگوں کی جنسی بے راہ روی کے قصوں کے پس منظر میں وہ اپنی ابتدائی جنسی تحریکوں کی بے باک عکاسی کرتے ہوئے کسی اخلاقی پابندی کا شکار نہیں ہوتے اور اپنی زندگی کے ایسے رازوں کو بھی قاری پر فاش کر دیتے ہیں جن سے اکثر بلکہ بیشتر خودنوشت نگار جان بوجھ کر کترا کے نکل جاتے ہیں۔ ایسے کئی واقعات ندا فاضلی کی یادداشتوں کی پہلی جلد 'دیواروں کے بیچ' کے صفحات میں بکھرے ہوئے ہیں۔

یادداشتیں مصنف کی ذات کی عکاسی کے ساتھ ساتھ اس کے احباب کی روداد بھی در پردہ بیان کرتی ہیں۔ وہ اپنے رشتے داروں، دوستوں اور ہم کاروں کے خاکے کھینچتا بھی ہے اور اڑاتا بھی ہے۔ چنانچہ ایسی تحریروں میں مختصر خاکہ نگاری بھی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔

ندا فاضلی نے چھوٹے چھوٹے کئی خاکوں سے اپنی یادداشتوں کو پر رونق بنایا ہے۔ان خاکوں میں محبت و خلوص کے پہلو بہ پہلو جذباتی وابستگی اور بے تکلفی کے کئی پہلو نمایاں ہیں۔

والدین کے خاکوں میں ماں سے بے انتہا محبت اور باپ کے رعب و دبدبہ کے ساتھ والد کی جنسی فتوحات پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔زہین ایک بازاری عورت ہے جس سے مصنف کے باپ کی شناسائی ہے۔ان کرداروں کی تصویر کشی میں نفرت سے زیادہ ایک ان چاہی وابستگی نمایاں نظر آتی ہے۔

آشا کے پاکستان جانے کے بعد زہین مذہب کی طرف مائل ہو گئی ہے مگر اپنے محبوب کی یاد سے کنارہ کش نہیں ہو پاتی ہے چنانچہ بار بار ندا کے پاس آکر سوال کرتی ہے کہ تمہارے باپ کا کوئی خط آیا ہے؟ وہ اچھے ہیں؟

محبت و خلوص و وفا کے یہ سودائی منافقین کے لئے عبرت کا تازیانہ ہیں۔ یہاں کردار حقیقی ہونے کے باوجود بھی داستانوی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔خود نوشت میں شامل یہ خاکے طویل بھی ہیں اور مختصر بھی اور یہ ندا کی انسان دوستی، مردم شناسی اور دردمندی کی عمدہ مثالیں بھی ہیں۔

سلام مچھلی شہری کا خاکہ شخصیت کے مثبت و منفی دونوں پہلوؤں کو روبرو لاتا ہے اور خاصے کی چیز ہے۔طوالت کے ڈر سے اقتباسات سے اجتناب کیا جاتا ہے۔

ندا فاضلی بنیادی طور پر شاعر ہیں چنانچہ حساس ہیں اور یادداشتوں میں ان کی یہ صلاحیت، دردمندی اور جذباتیت کے روپ میں نظر آتی ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ جس میں ایک لڑکے کی موت کے حالات بیان کئے ہیں وہ ندا کی دردمندی کی مثال ہے:

'وہ دو دن تک غائب رہتا ہے۔ ماں ادھر ادھر پڑوس میں اپنا دکھ سناتی رہتی ہے۔ باپ بھائی بھی اسے تلاش کرتے ہیں۔ تیسرے دن تگراندی کے کنارے ملاجی اپنے لڑکے کو پہچان کر ٹھنڈی سانس سے اللہ اکبر کہتے ہیں اور لاش لے کر گھر آجاتے ہیں۔ جمیل کی تدفین کے بعد جو چندہ اٹھایا جاتا ہے اس میں سب سے بڑا حصہ پنجابی کا ہوتا ہے۔ اس کا اپنا غم آج پھر سے ہرا ہو گیا ہے۔ملکی تقسیم پنجابی کو پہلوان بننے سے روکتی ہے اور جمیل کو غریبی لے ڈوبتی ہے۔اس کی آنکھ میں آنسو ہیں۔ دوسرے کے غم کو بہانا بنا کر ہم اکثر اپنے ہی کسی غم کو روتے ہیں۔'

دردمندی کی ایسی مثالیں جا بجا نظر آتی ہیں۔ شاعر ہونے کی حیثیت سے ندا فاضلی رومان پسند اور حسن پرست بھی واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ اپنی زندگی

کے اس پہلو پر بھی وہ بیباکانہ اظہار خیال کرتے ہیں۔ جنسی وابستگی کے علاوہ رومانوی عشق بازی کے قصے بھی یادداشتوں کی زینت بنتے ہیں۔ صنف نازک کا ذکر کرتے ہوئے ان کا قلم لطافت اور جذباتیت کے دریا بہاتا ہے۔ یہاں صرف ایک اقتباس:

'وہ ہر پیریڈ میں ندا کی نشست سے مختلف زاویں میں بیٹھی ہے۔ ہندی کلاس میں یہ زاویہ ۴۵ کا ہوتا ہے اور انگریزی میں دو کرسیوں کے پیچھے ٹھیک ۹۰ کا اینگل بنتا ہے۔ اس کی کمر کا ایک حصہ اونچے بلاؤز اور ناف سے نیچے بندھی ساڑی کے درمیان آئینے کی طرح چمکتا ہے۔ اس کے ہلنے سے اس آئینے میں سلوٹیں سی ابھرتی ڈوبتی ہیں۔ وہ جس دن جو ساڑی اور بلاوز پہن کر آتی ہے وہی اس دن کے موسم کے مزاج کے مطابق ہوتے ہیں۔ اس کا انتخاب فطرت کے نظام میں مداخلت کرنے کا قائل نہیں ہے۔ اس کی یہی سلیقہ مندی ندا کو متوجہ کئے ہوئے ہے۔ وہ کالج کے باغ میں باغ کا حصہ محسوس ہوتی ہے۔ سڑک پر چلتے ہوئے سڑک کی کمی کو پورا کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔'

ندا فاضلی کی نثر نگاری کی ایک اہم خصوصیت اقوال سازی ہے جو نا دانستہ طور پر ان کی عبارتوں کا حصہ بنتی ہے۔ ان اقوال میں زیست کی سچائیوں کا ذکر کرتے ہوئے ندا فاضلی کا شاعر نثر میں شعری خصوصیات پیدا کر دیتا ہے۔ ایسے اقوال خوبصورت اشعار کی مانند ان کی نثر میں جا بجا موجود ہیں۔ اشعار کے علاوہ اقوال سازی کی رنگ آمیزی نے ان کی نثر کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ یہاں چند اقوال پیش کئے جاتے ہیں:

'دوسرے کے غم کو بہانا بنا کر ہم اکثر اپنے ہی کسی غم کو روتے ہیں۔'

'پیڑوں میں ہندو مسلمان تھوڑے ہی ہوتے ہیں جو ایک شہر کو چھوڑ کر دوسرے شہر میں پناہ گزیں ہوں۔'

'زندگی ہی زندگی کی خوراک ہے۔'

'مذہب تو انسان کا ہوتا ہے۔ اینٹ پتھروں میں ذات پات کہاں ہوتی ہے۔'

مندرجہ بالا تمام خصوصیات کے بموجب ندا فاضلی کی نثر قرأت کا ایک خوشگوار تجزیہ بن جاتی ہے جس کے مطالعہ سے انبساط کے ساتھ ساتھ ایک بھرپور زندگی کے خدوخال ابھرتے ہیں اور اس کے پس منظر میں کئی دنیا آباد ہوتی چلی جاتی ہیں۔

سید عبد اللہ نے آپ بیتیوں کی ادبی اور موضوعاتی خامیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

'اکثر آپ بیتیاں یا تو محض منھ پھٹ پردہ داری کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں یا چیدہ چیدہ واقعات کے اردگرد گھومتی ہیں یا زندگی کا بیرونی خاکہ بن جاتی ہیں یا اپنا اشتہار بن کر تجارت کا ذریعہ بنتی ہیں۔'

سید عبد اللہ کے اس قول کے برخلاف ندا فاضلی کی آپ بیتی نہ منھ پھٹ پردہ داری ہے اور نہ ہی چیدہ چیدہ واقعات کی تکرار اور نہ ہی تجارت کا ذریعہ۔ یہ تو ایک مخلص انسان کی یادداشتیں ہیں جن میں اس کی زندگی اور اس کے اردگرد پھیلی ہوئی دنیا کی روداد ہے جسے مخصوص اسلوب نگارش نے قابل قرأت بنا دیا ہے۔

❑❑❑

'نیا دور' کو ایسی ادبی تخلیقات کا شدت سے انتظار ہے جو نہ صرف دلچسپ بلکہ معلوماتی بھی ہوں۔ ایسی تخلیقات جو اعلیٰ درجے کے ادبی شہ پاروں کی حیثیت رکھتی ہیں مگر عام قاری کی دلچسپی سے عاری ہوں تو اسے 'نیا دور' اپنی اشاعتی ترجیحات میں شامل کرنے سے گریز کرے گا کیونکہ معاملہ دراصل اردو کے فروغ کا ہے۔ اردو محض یونیورسٹیوں کے شعبوں، تحقیقی اداروں اور دیگر اردو مراکز تک اپنی مخصوص ضرورتوں کے تحت محدود رہے، اس روش سے بہرحال پرہیز کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہم سب کا اولین فریضہ ہے کہ اردو زبان کے فروغ میں پوری تندہی کے ساتھ شامل رہیں اور عام قاری سے اردو کے مراسم کو استوار کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ تخلیق کا غیر مطبوعہ ہونا لازمی شرط ہے۔ تخلیق کے ساتھ اپنی تصویر، ٹکٹ لگا ہوا لفافہ معہ پتہ اور بینک اکاؤنٹ نمبر، آئی.ایف.ایس.سی.، برانچ کوڈ والا Cancelled Cheque بھی ضرور ارسال کریں۔ **بغیر بینک تفصیلات کے حاصل ہونے والی تخلیقات کسی بھی صورت میں شائع نہیں کی جائیں گی کیونکہ اس کے سبب ہی دیگر تخلیق کاروں کے اعزازیہ میں غیر ضروری تاخیر ہوتی ہے۔**

ندا فاضلی کسی اسلوب کے اسیر نہیں نئی زمین تلاشنے میں کامیاب

شاہ نواز قریشی

خاکہ نویس، مزاح نگار

انشاء پرداز، شاعر و افسانہ نگار

'نیا دور' کے سابق مدیر

صحافت کے میدان میں بھی فعال،

کئی کتابوں کے مصنف

وطن لکھنؤ

265/63، تکیہ جنگ علی شاہ،

وکٹوریہ گنج، لکھنؤ

رابطہ: 9956813853

ندا فاضلی کا شمار جدید لہجے کے نمائندہ شاعروں میں ہوتا ہے عصری شعور اور نئی حسّیت کی عکاسی ان کی شاعری میں جس انداز و آہنگ میں ہوئی ہے وہ ندا کی انفرادیت کا ضامن ہے۔ جدیدیت کے عروج کے زمانے میں ان کے اس شعر کا بہت چرچا رہا کہ:

سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا
کھڑکی کے پردے کھینچ دیے رات ہوگئی

اس شعر پر بحثیں بھی ہوئیں اور اس پر اعتراضات بھی ہوئے کہ یہی اگر جدیدیت ہے تو اس سے بچنا چاہئے۔ اس شعر کو مضحکہ خیز بھی کہا گیا۔ ایک معترض نے ندا سے کہا کہ آپ خود اس شعر کی تشریح کیا کریں گے۔ تو انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ دیکھئے دیہاتوں میں صبح کی آمد کا اعلان مرغ اپنی بانگ سے کرتا ہے جس سے عموماً لوگ بیدار ہو جاتے ہیں۔ لیکن شہروں میں فلیٹ میں رہنے والوں کو صبح ہونے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ دن چاہے جتنا گزر گیا ہو، ان کے فلیٹ کی کھڑکی کے پردے اگر گرے ہوئے ہوں تو انہیں یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ دن کتنا گزر چکا ہے۔

ندا کی وضاحت قابل قبول ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود شعر اس مفہوم تک لے جانے میں مجموعی طور پر ناکام ہے۔ اگرچہ اس غزل کے اس شعر کی خاصی ستائش بھی ہوئی کہ:

دیکھا جو اس کا حال تو کترا کے چل دیے
اس کی پھٹی قمیص مرے ساتھ ہوگئی

ندا کی شاعری میں جو تیکھا اور نوکیلا طنز ملتا ہے وہ کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ہے۔ عصری سماج کی ناہمواریوں اور تضادات، اس سماج میں رہنے والوں کے انفرادی و اجتماعی مسائل، ان کی نفسیات، تصنع اور بناوٹی طرز حیات، خوابوں کی شکست و ریخت، آدرشوں کے بکھراؤ، اور اخلاقی اقدار کی بے وقعتی کی عکاسی جس تیکھے انداز میں ندا نے اپنی شاعری میں کی ہے وہ عدیم المثال ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیں:

صرف آنکھوں سے ہی دنیا نہیں دیکھی جاتی
دل کی دھڑکن کو بھی بینائی بنا کر دیکھو

من بیراگی تن انوراگی قدم قدم دشواری ہے
جیون جینا سہل نہ جانو بہت بڑی فنکاری ہے

.....

انسان میں حیوان یہاں بھی ہے وہاں بھی
اللہ نگہبان یہاں بھی ہے وہاں بھی

.....

ہندو بھی مزے میں ہیں مسلماں بھی مزے میں
انسان پریشان یہاں بھی ہے وہاں بھی

.....

محبت میں وفاداری سے بچیے
جہاں تک ہو اداکاری سے بچیے
ہر اک صورت بھلی لگتی ہے کچھ دن
لہو کی شعبدہ کاری سے بچیے
شرافت، آدمیت، دردمندی
بڑے شہروں میں بیماری سے بچیے

.....

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجئے رشتہ
دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیے

.....

جس سے ملیں جھک کے ملیں ہنس کے ہوں رخصت
اس شہر میں اخلاق بھی پیشہ نظر آئے

.....

ندا کا ایک دوہا:

بچہ بولا دیکھ کے مسجد عالی شان
اللہ تیرے ایک کو اتنا بڑا مکان

اور یہ شعر:

گھر سے مسجد ہے بہت دور چلوں یوں کرلیں
کسی روتے ہوئے بچے کو ہنسایا جائے

.....

اس کے علاوہ ندا کی نظم ''لفظوں کا پل'' بھی قابل اعتراض ٹھہری۔ جو اس طرح ہے کہ:

جز دانوں میں رکھے آدرشوں کو
دیمک کب کی چاٹ چکی ہے
رنگ گلابی نیلے پیلے
کہیں نہیں ہیں
تم اُس جانب
میں اِس جانب
بیچ میں میلوں گہرا غار
لفظوں کا پل ٹوٹ چکا ہے
تم بھی تنہا
میں بھی تنہا

ندا فاضلی گاؤں سے بمبئی آئے تھے۔ سچائی یہ ہے کہ بمبئی آ کر بھی گاؤں ان کے اندر موجود بلکہ بسا رہا۔ انہوں نے اپنے مجموعے لفظوں کا پل کے حوالے سے اپنی شاعری کے بارے میں خود لکھا ہے:

''لفظوں کا پل میں شامل غزلیں، نظمیں، گیت اور قطعات اس معاشرے کی دین ہیں جو فاصلوں اور دوریوں میں ایک دوسرے سے لاتعلق نہیں ہوا تھا۔ ایک گھر کا دکھ پورے محلہ کا غم ہوتا تھا۔ ایک حادثہ پر پورا شہر روتا تھا۔ اس ماتم میں انسانوں کے ساتھ درخت، تالاب، راستوں میں گھومتے پھرتے جانور، اڑتے ہوئے پرندے، مکانوں کے چھجے سب شریک ہوتے تھے۔'' لیکن بمبئی آ کر انہوں نے دیکھا کہ نصف دن گزرنے کے بعد بھی کھڑکی کے پردے کھینچ دینے پر رات ہوجاتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ بمبئی میں ''بسوں کی سیٹ سے سورج طلوع ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر سلیم محی الدین نے اپنے مضمون ''شہر میں بسا گاؤں: ندا فاضلی'' میں بجا طور پر لکھا ہے کہ

''کسی قسم کی نظریاتی شدت پسندی کے بغیر ندا کی شاعری انسانی فطرت، اس کے مثبت و منفی پہلو، فرد کی تنہائی، ارباب سیاست کی عیاری، مذہب کے نام پر تجارت، فرقہ واریت کی تباہ کاری اور دم توڑتی ہوئی انسانیت کا نوحہ ہے۔''

ندا فاضلی کی امیج ڈاکٹر سلیم محی الدین کے لفظوں میں ''لے کر ہاتھ میں اک تارا گاتا جائے بنجارا'' والی امیج ہے۔ جس کا براہ راست رشتہ کبیر کے پنتھ سے ملتا ہے۔ ندا بھی کبیر پنتھی تھے۔''

وارث علوی نے ان کے بارے میں کہا تھا کہ ''ندا کسی اسلوب کے اسیر نہیں اور وہ ایک نئی زمین میں اپنی جڑیں تلاش کرنے میں کامیاب ہے۔''

ندا فاضلی کی ایک غزل خالص رومانی مزاج کی حامل ہے۔ جسے آنجہانی جگجیت سنگھ نے ایک فلم میں گایا تھا اور اس طرح گایا تھا کہ انہوں نے اس کی معنوی فضا کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ بلکہ یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ جگجیت سنگھ اس غزل کی روح میں اتر گئے تھے اور اس طرح اسے دوآتشہ بنا دیا تھا۔

اس غزل کا مطلع۔

ہوش والوں کو خبر کیا بے خودی کیا چیز ہے
عشق کیجیے پھر سمجھئے زندگی کیا چیز ہے

تصوف کی حدوں کو چھو رہا ہے۔

اس غزل کے اور اشعار خاص طور سے یہ شعر کہ:

ان سے نظریں کیا ملیں روشن فضائیں ہوگئیں
آج جانا پیار کی جادوگری کیا چیز ہے

اس حقیقت کے مظہر ہیں کہ ندا کو رومانوی اظہار پر بھی بے پناہ قدرت حاصل تھی۔

ندا کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کا ایک مخصوص لہجہ ہے اور اسی سے ان کی پہچان ہوتی ہے۔ ان کے اشعار ان کا نام لکھے بغیر لکھ دیئے جائیں تو ان کا لہجہ بتا دیتا ہے کہ یہ اشعار ندا فاضلی کے ہیں۔

❑❑❑

اپنے عہد کا ایک درویش صفت اور قلندرانہ مزاج شاعر ندا فاضلی

حسن کاظمی

ملکی وغیر ملکی مشاعروں
کے محبوب شاعر، کئی انعامات
واعزازات سے سرفراز
صحافت میں بھی سرگرم
دو شعری مجموعے شائع
وطن کانپور

قمر اپارٹمنٹ، نظام باغ
کچا پل چوپٹیا، لکھنؤ
رابطہ: 7607863786

ندا فاضلی سے میری پہلی ملاقات کانپور کے موتی جھیل کے مشاعرے میں ہوئی۔ میری شاعری کا آغاز تھا۔ میرے خالو مرحوم شیدا بقائی صاحب اس معیاری مشاعرے کے روح رواں ہوتے تھے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اس کی نظامت فرماتے تھے۔ بقائی صاحب کو جب علم ہوا کہ مجھے بھی شاعری سے عشق ہے تو مجھے ان عظیم شعراء کی خاطر مدارات پر معمور کر دیا کہ ان سب کا گیسٹ ہاؤس اور تمام انتظامات میں مجھے لگا دیا۔ ۱۹۷۸ء کے مشاعرے میں کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، ندا فاضلی، ڈاکٹر بشیر بدر، شہر یار، نشور واحدی، مخمور سعیدی، امیر آغا قزلباش، گلزار دہلوی، وسیم بریلوی وغیرہ تشریف لائے ہوئے تھے بالخصوص شہر یار صاحب اور ندا فاضلی صاحب۔ شہر یار صاحب نے دوسرے دن علی گڑھ واپسی کے وقت مجھ سے کہا کہ علی گڑھ نمائش کے مشاعرے کنوینر میرے دوست ہیں ظفر صاحب، ان کا خط آئے گا۔ تم علی گڑھ مشاعرے میں آنا۔

کچھ ہی روز بعد مجھے ظفر صاحب کی جانب سے علی گڑھ نمائش کے مشاعرے کا دعوت نامہ موصول ہو گیا اور ہم مقررہ تاریخ کو علی گڑھ پہنچ گئے اور شہر یار صاحب کے گھر ہی قیام کیا جہاں ندا صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ ندا صاحب سے یہ دوسری ملاقات تھی۔ تیسرے دن ندا صاحب دہلی کے لئے روانہ ہونے لگے تو مجھ سے بولے، کیا پروگرام ہے؟ میں نے کہا، بس کانپور ہی جاؤں گا اور کہیں کوئی پروگرام نہیں ہے تو بولے، چلو دہلی۔ ایوان غالب کا مشاعرہ ہے۔ آپ کو پڑھوا دیں گے۔ بس خوشی خوشی ندا صاحب کے ہمراہ دہلی کے سفر پر نکل گیا۔ میں بہت خوش نصیب ہوں کہ مجھے شاعری کے سفر میں ایسے عظیم المرتبت شخصیات کی سرپرستی میں مشاعرے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ ایوان غالب دہلی کے مشاعرے کے بعد ندا صاحب ایک دن دہلی رک کر بمبئی کے لئے روانہ ہو گئے اور میں کانپور واپس ہو لیا۔

ان سے خط و کتابت بھی رہی تھی اور ٹیلیفون سے بھی رابطہ رہتا تھا۔ بڑی حوصلہ افزائی کرتے تھے جس کے سبب میں چند برسوں میں ملک کے مختلف گوشوں میں مشاہیر شعراء کے بیچ ایک طفل مکتب مقبول ہوتا چلا گیا۔ ۱۹۸۲ء میں میں نے بی اے کر لیا تھا اور لکھنؤ دور درشن میں اکثر و بیشتر شعری نشستوں اور ریڈیو کے پروگراموں کے سبب لکھنؤ کے سینئر شعراء کے بھی نزدیک ہوتا گیا۔

۱۹۸۶ء میں ترقی پسند تحریک کی گولڈن جبلی کانفرنس لکھنؤ میں ہی ہونی تھی۔ کیفی اعظمی صاحب اس کے صدر تھے۔ کانفرنس میں ساری دنیا سے ترقی پسند شعراء و ادباء لکھنؤ تشریف لا رہے تھے جس میں فیض احمد فیض کی بیگم ایلس فیض، بیٹی سلیمہ ہاشمی، عاشور کاظمی، حمایت علی شاہ، قتیل شفائی، جمیل الدین عالی، انتظار حسین، مجروح سلطانپوری، گوپی چند نارنگ، عزیز قدسی، ندا فاضلی، باقر مہدی، غلام ربانی تاباں، عصمت چغتائی، علی سردار جعفری، ڈاکٹر قمر رئیس، امجد اسلام امجد، عطا الحق قاسمی، افتخار عارف، کشور ناہید، لڈمیلا وسیلوا، انا سنوورواء، ڈاکٹر حامد کاشمیری، ڈاکٹر زبیر طارق، فہمیدہ ریاض رالف رسل، ڈیوڈ میتھیوز، محمد علی صدیقی، غرض کہ دنیا کا کوئی بھی بڑے سے بڑا ترقی پسند ادیب ایسا نہیں تھا جو اس میں شریک نہ ہوا ہو۔

ایک شب کلارکس اودھ ہوٹل میں افتتاحی تقریب کے بعد سارے شعراء و ادباء جمع ہوئے کھانے سے قبل سردار جعفری صاحب، کیفی صاحب، ندا صاحب، جمیل الدین عالی صاحب، گوپی چند نارنگ صاحب، ایک کمرے میں جمع ہوئے اور سب کا مشغلہ شروع ہو گیا۔ میں ان کی خدمت پر معمور تھا۔ سردار جعفری صاحب نے مجھے حکم دیا کہ حسن ایلس فیض اور سلیمہ ہاشمی کس کمرے میں ہیں ان کو بھی بلاؤ۔ میں فوراً ان کے کمرے میں گیا اور دیکھا کہ ایلس فیض سر پر پٹی رکھے لیٹی ہیں۔ میں نے کہا، مما کیا ہوا؟ آپ کو جعفری صاحب یاد فرما رہے ہیں۔ سلمہ ہاشمی نے کہا، مما کی طبیعت ٹھیک نہیں، انہیں آرام کرنے دیں، میں چلتی ہوں۔ سلمہ آ گئیں تو سب نے ان کو بھی آفر کیا تو وہ بولیں، میں نے کھانا کھا لیا ہے مگر آپ لوگوں کا ساتھ دیتی ہوں مجھے تھوڑی سی نیٹ دے دیجئے اور وہ سب کے ساتھ Sip کرنے لگیں۔ اتنے میں ندا فاضلی نے کہا، حسن! جگجیت سنگھ بھی تو اسی ہوٹل میں ہے۔ میں نے کہا، جی، بغل کے کمرے میں ہیں تو جعفری صاحب نے کہا، انہیں بھی بلایئے۔ میں نے جگجیت کے کمرے میں دستک دی اور ان کو بتایا کہ سارے لوگ جمع ہیں اور آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔ جگجیت اپنی Scotch کی بوتل دکھاتے ہوئے بولے کہ یار میں تو شروع کر چکا ہوں۔ میرا Brand چینج ہو جائے گا۔ میں نے کہا، آپ اپنی بوتل ساتھ لے چلئے، سب کو کمپنی دے دیجئے گا تو وہ بولے، ہاں یہ ٹھیک ہے، اور وہ اپنا پیگ لے کر سب کے ساتھ آ گئے۔

اس بیچ ممبئی سے جگجیت سنگھ کے لئے کوئی کال آ جاتی ہے تو وہ معذرت کر کے اپنے کمرے میں فون ریسیو کرنے چلے جاتے ہیں۔ تبھی ندا فاضلی کی آواز گونجتی ہے کہ دیکھئے صاحب، ہمارا کلام گا گا کر وہ اسکا چ پی رہا ہے اور ہم سب ٹھرا پی رہے ہیں اور ان کے اس طنز پر سب نے زور دار ٹھہا کا لگایا اور ماحول بہت دلچسپ اور خوشگوار ہوتا گیا۔ تھوڑی دیر میں جگجیت سنگھ دوبارہ اس محفل کا حصہ بن گئے۔ اسی بیچ رات کے مشاعرے میں پڑھا گیا شعر جگجیت سنگھ کو یاد آیا۔ انہوں نے کہا کہ حسن رات تم نے اردو والا کیا شعر پڑھا تھا، ذرا سناؤ۔ میں نے شعر سنایا کہ:

سب مرے چاہنے والے ہیں مرا کوئی نہیں
میں بھی اس شہر میں اردو کی طرح رہتا ہوں

جگجیت نے کہا، میں ذہانت کی داد دوں گا۔ حسن کاظمی، یار تم اردو کو اتنا محدود کیوں کر رہے ہو۔ اردو کو ساری دنیا میں پھیلاؤ، اس کو شہر تک کیوں محدود کر رہے ہو، میں جگجیت سنگھ ہوں، ساری دنیا میں اردو کی غزلوں کی وجہ سے اپنی شناخت رکھتا ہوں۔ فوراً ندا بھائی نے زور سے کہا، ارے واہ، کیا بات ہے، بالکل سہی ہے۔ مصرع بدل لو۔

میں بھی اس ملک میں اردو کی طرح رہتا ہوں
سب مرے چاہنے والے ہیں مرا کوئی نہیں

یہ شعر ندا صاحب نے پڑھا تو ہندی کے اس عہد کے سب سے بڑے ناقد ڈاکٹر نامور سنگھ پروگرام دیکھ رہے تھے اور انہوں نے میرا یہ شعر نوٹ کر لیا اور اپنی اگلی کتاب میں اس کو ندا فاضلی کے نام سے کوڈ کیا کہ ندا فاضلی نے اردو زبان پر کتنا بڑا شعر کہا ہے۔ انہوں نے ملک نہیں دیش کہا ہے اور داغ نے اپنے عہد کی ترجمانی کی تھی کہ

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

مگر اپنے عہد کی ترجمانی کرنے والا یہ شعر اتنے برسوں بعد ہوا ہے۔ نامور جی نے تقریباً ڈیڑھ صفحے میں اس شعر کی تعریف کی ہے۔ ایک دن ندا بھائی نے فون کیا اور یہ واقعہ بتایا کہ یار اس جاہل نے تمہارے شعر کو میرے نام سے کوڈ کیا ہے تو میں نے خوش ہو کر کہا، ندا بھائی، کوئی بات نہیں۔ یہ شعر اب اور مستند اور بڑا ہو گیا۔ میں اتنے برسوں سے پڑھ رہا ہوں، سبھی جانتے ہیں کہ یہ حسن کاظمی کا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ اس کے بعد ندا بھائی سے میرے مراسم بہت گہرے ہو گئے۔ زندگی کے آخری دنوں تک قائم رہے۔ 'پھاڑے رہے ہو' ان کا تکیہ کلام تھا جو وہ چند بے تکلف دوستوں سے ہی کہتے تھے۔ ان میں دہلی میں آج تک کے کریٹیو ہیڈ ناظم نقوی اور ادبی کوکٹیل کے پروڈیوسر انل گنگوار شامل تھے۔ ندا بھائی اکثر و بیشتر لکھنؤ اور آس پاس کے مشاعروں میں آتے تھے تو میرے گھر ہی قیام کرتے تھے اور یہ سلسلہ میری شادی کے بعد تک جاری رہا۔

ندا بھائی جتنے سنجیدہ، دانشور، ادیب، صحافی، عالم، فاضل ہوتے ہوئے زیادہ دیر سنجیدہ نہیں رہ پاتے تھے۔ ان کے اندر جو ایک بچہ تھا وہ تھوڑی تھوڑی دیر میں ان کی آنکھوں میں شرارتیں کرتا ہوا جھانکنے لگتا تھا۔ ان کے ساتھ سڑک پر اگر پیدل چل رہے ہوں تو بھی وہ بچوں کے ساتھ شیطانیاں کرنے لگتے تھے۔ ان کو چھیڑتے تھے، ان کو ٹافی، چاکلیٹ وغیرہ جیب سے نکال کر دیتے تھے۔ بچے ان سے بہت مانوس ہو جاتے۔ ان کو دوست سمجھتے تھے اور بے تکلف بھی ہو جاتے تھے۔ اکثر و بیشتر ندا بھائی، سینئر شعراء اور اپنے ہم عصر شعراء جو مشاعرے میں شریک رہتے تھے، ان سے پنگے بازی کرتے رہتے

تھے، برا بھلا بھی کہہ دیتے تھے، اکثر گالیاں بھی دے دیتے تھے جس کے سبب ہر کوئی ان سے گھبرایا بھی رہتا تھا۔ اکثر و بیشتر مشاعرہ کی نظامت کے دوران وہ جملہ بازی کر دیتے تھے جس کے سبب مشاعروں کے بعد قیام گاہ پر خوب ہنگامے بھی ہوتے تھے۔ مشاعروں میں شریک شعراء اکثر مشاعرے میں شغل فرماتے تھے پھر تو تو میں میں بھی ہوتی تھی۔ بیشتر جگہوں پر میں ساتھ ہوتا تھا تو سنبھالے رہتا تھا اور وہ برا بھلا کہہ کے مان بھی جاتے تھے اور بعد میں ہنسنے لگتے تھے کہ آج فلاں کی میں نے یہ کر دی، وہ کر دی۔ صبح بالکل نارمل ہوتے تھے۔ میں اکثر ممبئی میں ہفتوں تک بلکہ مہینوں ندا بھائی کے گھر کیفی اعظمی صاحب کے گھر اور جاوید اختر کے گھر رہتا تھا۔ ایک بار ایک ہفتہ سے زیادہ ندا بھائی کے گھر رکا اور ایک شام میں نے ان سے کہا، ندا بھائی! آپ ایک ہفتے سے زیادہ گھر میں ہیں جب کہ آپ کے پاس ہر برانڈ کی ایک سے ایک قیمتی مئے نوشی کی اشیاء ہیں مگر آپ نہیں لے رہے ہیں۔ باہر تو آپ بڑے سرور میں رہتے ہیں تو بولے، یار مشاعرے میں اسٹیج کا معاملہ ہوتا ہے۔ تھوڑا ڈرنک کرنا پڑتا ہے اس لئے وہاں کرتا ہوں ورنہ میں عادی نہیں ہوں اور میں نے کبھی دن میں نہیں لی اور اس کا میں خود گواہ ہوں کہ ہندوستان کے مختلف شہروں اور ملک کے باہر بھی لوگ ہاتھ جوڑے خدمت میں کھڑے رہتے تھے مگر کبھی دن میں شغل نہیں کرتے تھے اور نہ زیادہ کہ مدہوش یا بیہوش ہونے جیسی صورت ہو۔

ایک بات یہ بتاتا چلوں کہ ندا فاضلی نے ایک کالم شروع کیا تھا 'ملاقاتیں' جس میں وہ ممبئی میں مشاہیر سے ملتے تھے، ان سے گفتگو کرنے کے بعد اس کالم میں بیشتر کی ادبی چھیچھا لیدر کر کے رکھ دیتے تھے جس کے سبب اس عہد کے سبھی شعراء اور ادباء ان سے خائف بھی رہتے تھے۔ کیفی صاحب نے کبھی میری کسی بھی بات پر کوئی اعتراض نہیں کیا مگر ایک بار میں کئی دن ندا فاضلی کے یہاں رہنے کے بعد واپس کیفی اعظمی صاحب کے یہاں جانکی کیٹر جوہو پہنچا تو انہوں نے پوچھا، کہاں غائب ہو جاتے ہو؟ تو میں نے کہا، ندا بھائی نے روک لیا تھا تو پہلی مرتبہ کیفی صاحب کی پیشانی پر میں نے تیوریاں چڑھی ہوئی دیکھیں، فرمانے لگے کہ حسن مجھے کوئی حق نہیں کہ میں کسی کے ذاتی رشتوں یا تعلقات پر اعتراض کروں مگر یہ تمہارا ندا سے اتنا ملنا جلنا مجھے پسند نہیں ہے۔ وہ بہت بیہودہ اور بدتمیز انسان ہے۔ اس نے ہمیشہ اپنے بزرگوں کی پگڑی اچھالی ہے۔ میں اسے ناپسند کرتا ہوں۔ (حالانکہ کیفی صاحب درست فرما رہے تھے مگر میں نے اخلاقی فرض سمجھتے ہوئے کیفی صاحب سے کہا) کیفی صاحب! یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ میں نے تو کبھی ان کی زبان سے آپ کے متعلق کبھی کچھ نہیں سنا۔ ہمیشہ آپ کی عظمتوں کے تذکرے کرتے سنا بلکہ آپ کو یاد ہوگا، دہلی میں ڈی سی ایم کے مشاعرے کے بعد ہم آپ ندا بھائی اور دبئی کے سلیم جعفری مرحوم آپ کے ساتھ ہوٹل کے کمرے تک آئے۔ سلیم جعفری آپ کا جشن دبئی میں کرنے کے خواہشمند تھے مگر آپ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ان کو جھٹک دیا تھا۔

میں ان کو رکنے کا اشارہ کر کے آپ کو کمرے میں بٹھا کر خود باہر چلا گیا تھا تو ندا فاضلی صاحب سلیم جعفری صاحب کو تسلی دے رہے تھے کہ کیفی صاحب بزرگ ہیں۔ آپ برا مت مانئے، ہم لوگ سمجھا لیں گے۔ آپ بتائیں، جشن میں کیا چاہئے، کن کن لوگوں کو بلانا چاہتے ہیں، میں پوری ذمہ داری لیتا ہوں اور ان کے مجلّے کے لئے مضمون وغیرہ سب لکھوا دوں گا۔ آپ تیاری کیجئے۔ یہ سنتے ہی کیفی صاحب ایک دم پگھل گئے۔ ارے میں تو ان کو بہت غلط سمجھتا تھا۔ ذرا ندا صاحب کو فون لگاؤ حسن! میں نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ندا بھائی کو فون لگایا، ادھر سے آواز آئی، ہلو... میں نے کہا، حسن بول رہا ہوں، ندا بھائی بولے، ارے کہاں پہنچ گئے؟ میں نے کہا، کیفی صاحب کے یہاں پہنچ گیا۔ کیفی صاحب بات کریں گے اور میں نے فون کیفی صاحب کو پکڑا دیا۔ کیفی صاحب کی آواز گونجی، اے بھائی ندا صاحب، ہم لوگ ممبئی میں رہتے ہوئے برسوں نہیں مل پاتے بس کبھی کبھی مشاعروں کے اسٹیج پر ہی ملاقات ہو پاتی ہے۔ ندا بولے، جی جی کیفی صاحب، آپ کی بھی مصروفیت رہتی ہے۔ آپ لکھنؤ اور گاؤں میں زیادہ رہتے ہیں۔ آپ جب حکم دیں، میں حاضر ہو جاؤں گا۔ کیفی صاحب نے کہا، بھائی اگر آج مصروف نہ ہوں تو شام کو تشریف لے آئیں تو ایک دو جام ٹکرائیں اور جو چٹنی روٹی ہو ساتھ کھا لیں۔ ندا صاحب نے کہا، جی جی میں حاضر ہوتا ہوں۔ (یہ وہ کارنامہ مجھ سے ہو گیا جس کے لئے میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں) شام کو دو مختلف سمتوں کا سنگم تھا۔

شام کو جانکی کیٹر کے سبزہ زار پر ادبی و ثقافتی ستاروں کی کہکشاں بکھری پڑی تھی۔ عہد ساز شخصیت مقبول فدا حسین اپنی بیٹی کے ساتھ، مقبول فلم ایکٹر اے کے ہنگل، چیتن آنند، جاوید اختر، شبانہ اعظمی، شوکت آپا، تنوی اعظمی، بابا اعظمی، فلم پروڈیوسر ستیش کوشک، فلم اداکارہ تبو اور متعدد فلمی اور غیر فلمی شخصیات کا اجتماع۔ مقبول فدا حسین صاحب ننگے پیر سامنے بیٹھے کیفی صاحب کی اگلی کتاب کے لئے ایک اسکیچ کھینچنے میں مصروف، جاوید اختر مختلف مشاہیر شعراء کی نقل کر کے انہیں کے انداز میں شعر سنا رہے ہیں مثلاً ڈاکٹر بشیر بدر، مجروح صاحب، خمار صاحب وغیرہ۔ بہت ہی خوبصورت محفل دیر رات تک چلتی رہی۔ آخر میں ہلکی بوندہ باندی ہونے لگی۔ ندا بھائی بولے، حسن، تم میرے گھر چلو، میں نے کیفی صاحب سے اجازت مانگی۔ انہوں نے فوراً اجازت دے دی اور حکم دیا کہ کم سے کم ایک بار دن میں فون کر کے خیریت دے دیا کرو۔ اس کے بعد بارش تیز سی ہو گئی۔ ہم اور ندا بھائی گیٹ تک آ گئے۔ مقبول فدا حسین صاحب نے ندا بھائی سے پوچھا، آپ لوگ کدھر جائیں گے؟ ندا نے کہا، ہم کھار جائیں گے۔ فدا صاحب نے کہا، آپ کا گھر میرے راستے میں پڑے گا، چلئے میں آپ لوگوں کو ڈراپ کرتا ہوا چلا

جاؤں گا۔ یہ فخر بھی مجھے حاصل ہوا کہ دنیا کے مایۂ ناز فنکار مقبول فدا حسین صاحب کے ساتھ اتنی خوبصورت شام گزری، اس کے بعد ایک مرتبہ جاوید اختر کے یہاں بھی میں کافی دن رکا تھا تو ایک دن جاوید نے بھی کہا، حسن میاں، آج ندا فاضلی صاحب کو بھی بلا لیجئے۔ کافی عرصہ ہو گیا، ندا صاحب کے ساتھ وہاں بھی ایک خوبصورت اور یادگار شام گزری، اس دن جاوید اختر صاحب سے ملنے اتفاقاً زینت امان اپنی کسی دوست کے ہمراہ اور ممتاز صحافی اور سیاسی رہنما سنتوش بھارتی اور ایکٹر دھیرج کمار بھی تشریف لائے تھے۔

لکھنؤ کے مشاعرے کی بات ہے۔ فہرست میں ۳۲ شعراء تھے جس میں ۱۰ شعراء مقامی اور قرب وجوار کے تھے۔ ندا صاحب اپنے ایک مداح کے ساتھ ایک کونے میں بیٹھے تھے۔ ان کا مداح ان کے لئے نیپکن سے لپٹا ہوا گلاس پیش کر چکا تھا۔ ندا صاحب نے اطہر نبی صاحب کو بولا۔ یار میں مقامی لوگوں سے واقف نہیں، کچھ کو حسن کاظمی پڑھوا دیں۔ بعد میں میں نظامت لے لوں گا۔ مرحوم والی آسی صاحب بھی تھے۔ انہوں نے کہا، ٹھیک ہے، حسن، میں تمہارے ساتھ بیٹھ جاتا ہوں۔ تم مشاعرہ شروع کرو۔ مشاعرے میں بشیر بدر، راحت اندوری، انجم رہبر، منظر بھوپالی، معراج فیض آبادی، کرشن بہاری نور، عمر انصاری، عرفان صدیقی، نور اندوری، ساغر خیامی، حسن کمال، ممتاز راشد جیسے ایک سے ایک معتبر نام تھے۔ بشیر بدر صاحب نے مجھ سے کہا، حسن، میری ۹ بجے ٹرین ہے۔ تو مجھے آدھے گھنٹے میں پڑھوا دینا۔ میں نے مشاعرہ شروع کر دیا اور کہا کہ آج مشاعرہ ہم وہاں سے شروع کرتے ہیں جہاں پہنچ کر عموماً مشاعرے ختم ہو جاتے ہیں۔ میں ڈاکٹر بشیر بدر صاحب کو آواز دے رہا ہوں۔ ڈاکٹر بشیر بدر نے مشاعروں کو بلندیوں پر پہنچا دیا۔ مشاعرہ خوبصورت ہو رہا تھا۔ ۵، ۶ شاعروں کے پڑھنے کے بعد ندا بھائی ڈائس پر آئے۔ میں نے مائک ان کے حوالے کرنا چاہا مگر انہوں نے کہا، ابھی کچھ اور پڑھواؤ، میں بعد میں کرلوں گا۔

اس طرح میں نے تقریباً ایک درجن شعراء کو پڑھوا دیا۔ کافی دیر بعد ندا بھائی پھر ڈائس پر آئے تو میں نے ان سے پھر اصرار کیا کہ اب تک میں نصف فہرست نمٹا چکا ہوں۔ اب آپ نظامت سنبھالئے، انہوں نے فرمایا، یار تم اچھا چلا رہے ہو، مشاعرہ۔ مجھے کچھ زیادہ بھی ہوگئی ہے، اس لئے اب تم ہی نظامت کرو۔ والی بھائی نے بھی کہا، ٹھیک ہے حسن، مشاعرہ ٹھیک چل رہا ہے۔ چلاتے رہو، اس طرح مشاعرہ بیحد کامیاب رہا اور اس مشاعرے کی کامیابی یہ رہی کہ اس میں کوئی شاعر ہوٹ یا ناکام نہیں ہوا۔ دوسرے دن

کلارکس اودھ میں اور اطہر نبی صاحب ندا بھائی سے ملنے گئے، خوب دلچسپ باتیں ہوتی رہیں اور ساتھ میں شعروشاعری بھی۔ ندا صاحب لکھنؤ اور قرب وجوار کے مشاعرے میں آتے تو خاکسار کے گھر ہی رکتے۔ اس زمانے میں میں اندرا نگر اور نیو حیدر آباد کے علاقہ میں رہتا تھا۔ ندا صاحب کو میں کبھی تکلیف نہیں ہونے دیتا تھا۔ میرے اسکوٹر پر ہی وہ سارے شہر میں سب سے ملاقات کرتے تھے۔ اس میں امین آباد میں نصرت پبلشر عابد سہیل صاحب، مکتبہ دین و ادب والی آسی صاحب اور دانش محل میں نسیم انہونوی صاحب، عمر انصاری صاحب اور عرفان صاحب سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے۔ ایک بار ان کو علم ہوا کہ نیر مسعود صاحب علیل ہیں تو میں ان کو لے کر نیر صاحب کے گھر گیا۔ کافی دیر پاس رہے اور عالمی ادب پر تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ ندا صاحب اکثر کہتے تھے، 'آئی بلیوان کمپینین شپ' وہ شادی جیسے بندھنوں سے بہت الجھتے تھے۔ میری کافی باتیں ہوتی تھیں مگر وہ اپنی پہلی شادی جو گوالیار میں ہوئی تھی، کبھی اس کی تفصیل میں نہیں جاتے تھے، گفتگو کا رخ موڑ دیتے تھے۔

مالتی جوشی گجراتی فلموں کی ایکٹریس اور خوبصورت آواز کی ملکہ ہیں۔ غزلوں کے عشق نے انہیں ندا فاضلی کے بیحد نزدیک کر دیا تھا اور نزدیکیاں اتنی بڑھیں کہ دونوں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔ میں ممبئی جاتا تو میرے لئے مالتی جی کے آنے کے بعد کوئی تکلیف نہیں رہتی تھی۔ میں ان کو مالتی دیدی کہتا ہوں۔ اکثر و بیشتر دونوں میں جھگڑے ہوتے رہتے تھے اور مالتی جی ناراض ہوکر کار کی چابی لے کر اپنے والد کے گھر چلی جاتی تھیں اور دوسرے یا تیسرے دن واپس آ جاتی تھیں۔ اکثر مجھ سے کہتی تھیں کہ آپ کے بھائی تو شادی کے قائل ہی نہیں ہیں۔ میں کہتا تھا رسمی سلسلہ نہیں ہے مگر دل سے دماغ سے اور سماجی طور پر بھی وہ آپ کو تسلیم کئے ہیں، آگے رسمی بھی ہو جائیں گے۔

مالتی جی گجراتی برہمن فیملی سے ہیں اس لئے پیور ویجی ٹیرین ہیں۔ میں ممبئی میں ہوتا تھا تو ندا صاحب سویرے چھ بجے اٹھا دیتے اور ہم دونوں کار سے باندرہ پانی ہل روڈ تک جاتے، وہاں کار کو پارک کر کے کارٹر روڈ پر مارننگ واک کرتے تھے۔ کارٹر روڈ پر نوشاد صاحب کی کوٹھی ہے آشیانہ، وہاں سے پیدل چلتے چلتے تقریباً سوا کلومیٹر پہ راجیش کھنہ کا عالیشان بنگلہ پرتیکچھا تھا۔ یہ واک کرنے کا راستہ تھا۔ اس مارننگ واک کے ہم سفر ہوتے تھے گلشن باورا، حسن کمال اور کبھی کبھی نقش

لائل پوری اور صبح ۹ بجے کے آس پاس جب ہم لوگ واپسی کر رہے ہوتے تھے تو نوشاد صاحب اپنی بالکنی میں ہیٹ وغیرہ لگا کر تیار ہوتے نظر آتے تھے۔ واپسی پر راستے میں ایک مارکٹ پڑتی تھی تو اکثر ندا بھائی بولتے یار چلو، فش لی جائے آج اور مارکٹ سے مچھلی یا مرغ لے کر گھر آجاتے اور تیاریاں شروع ہو جاتی تھیں۔ مالتی جی کو پتہ لگتا کہ آج ان لوگوں کا نان ویج بنانے کا پروگرام ہے تو وہ کار لے کر میکے چلی جاتی تھیں اور دوسرے دن آتی تھیں۔ ہم لوگوں کے کڑھائی اور برتن الگ کر دئے جاتے تھے اور حکم ہوتا تھا کہ فلاں کو کر اور کڑھائی، فلاں چمچ کے علاوہ دوسرے مت چھوئیے گا۔ دوسرے دن آتی تھیں تو کام والی بائی سے سارے برتن خوب خوب منجھواتی تھیں۔

مالتی جی کے جاتے ہی گھر پہ ہم لوگوں کا راج ہوتا تھا۔ میں کلنگ میں کافی دلچسپی رکھتا تھا۔ اس لئے ندا بھائی اور ہم دونوں اسی ایک ہی ہانڈی پر اپنے اپنے ہنر دکھاتے تھے۔ اتفاق سے کبھی کبھی اچھی ڈش بن جاتی تھی تو ندا بھائی جگجیت سنگھ، چندن داس یا اوشا کھنہ کو فون کر دیتے تھے۔ وہ لوگ آجاتے تھے تو شام اور بھی رنگین ہو جاتی تھی۔ ندا صاحب کے گھریلو مراسم بہت کم لوگوں سے تھے۔ حالانکہ وہ بڑے گھریلو مزاج کے تھے۔ رشتوں کو برتتے اور ان کو نباہتے بھی تھے۔ ندا صاحب کا ایک کردار اور بیان کر دوں کہ ندا صاحب اگر ناظم نقوی کے گھر رکتے، وہاں انہیں کھلا ماحول ملتا۔ شام کے کھانے کے قبل وہ لوگ ایک آدھ جام لڑاتے مگر میرے گھر اس طرح کی کوئی گنجائش نہیں تھی پھر بھی میں نے ندا صاحب سے کہا کہ آپ کے پاس تو سامان ہے، کمرہ آپ کا الگ ہے۔ میں پانی وغیرہ لا دوں، آپ شغل فرمالیں مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ تمہارے گھر جب اس طرح کا ماحول نہیں ہے تو میں نہیں لوں گا اور انہوں نے بچوں کے ساتھ بہت خوش ہو کے کھانا کھایا اور آرام سے سو گئے۔ دوسرے دن وہ ضد کرنے لگے کہ مجھے ایوان غالب دہلی پہنچا دو، وہاں شاہد ماہلی کے گیسٹ ہاؤس میں رک جاؤں گا ایک دن۔ پرسوں میں نکل جاؤں گا۔ میں نے کہا، آپ آرام سے رہئے، یہاں کوئی دقت نہیں ہے مگر ندا صاحب کو یہ احساس کہ ناظم نقوی کو برا لگا ہوگا تو ظاہر کرنے کے لئے کہ دیکھو میں حسن کاظمی کے گھر بھی نہیں رکا، میں غالب انسٹی ٹیوٹ آ گیا۔ ندا بھائی بہت نازک مزاج اور بہت حساس انسان تھے۔ ذرا سی بھی کسی کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

ایسے ہی ایک بار وہ مالتی دیدی اور گڑیا کو لے کر دہلی آئے۔ مجھے فون بھی نہیں کیا۔ اس وقت ناظم دوارکا میں رہ رہے تھے جو ائیر پورٹ کے بالکل نزدیک تھا۔ ناظم کے گھر سے مجھے فون کیا کہ میں دہلی میں ہوں۔ مالتی اور گڑیا بھی ساتھ میں ہیں۔ میں نے تھوڑی ناراضگی جتائی تو انہوں نے کہا، ناظم! ائیر پورٹ کے نزدیک تھے اس لئے آپ کو زحمت نہیں دی۔ اب کئی دن رکنا ہے تو یہاں سے آپ کے گھر ہی آجاؤں گا۔ پھر انہوں نے کہا کہ مجھے پتہ نہیں تھا مجھے آج شام دبئی جانا ہے۔ آپ ایک کام کیجئے۔ ۳ بجے کناٹ پلیس پہ گاڑی لے کے آجائیے۔ مالتی اور گڑیا کو آپ اپنے گھر لے جائیے، میں دبئی نکل جاؤں گا۔ دو دن کے بعد ان کو ناظم کے گھر پر چھوڑ دیجئے گا۔ یہ لوگ ممبئی چلے جائیں گے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی مالتی جی نے کہا، حسن بھائی، بمبئی میں آپ کو گھماتی تھی۔ آج آپ دہلی میں ہم لوگوں کو گھما رہے ہیں۔ ندا صاحب بہت کم ڈرائیو کرتے تھے۔ ہمیشہ کہیں بھی جانا ہوتا تھا تو مالتی جی ہی کار ڈرائیو کرتی تھیں۔ ندا صاحب کے کھار والے فلیٹ پر پیچھے والی بالکنی میں ایک مرغا اکثر آجاتا تھا اور اکثر وہ گندگی وغیرہ کر جاتا تھا۔ ایک دن میں باتھ روم میں نہانے جا رہا تھا تو وہ مرغا مجھے دکھ گیا، کسی طرح میں نے اس کو پچکار کر کھڑکی سے اندر کر کے پکڑ لیا۔ اب ندا صاحب کے اندر کا بچہ دیکھنے والا تھا۔ ان کی آنکھوں میں بچپنا اور شوخی دیکھنے والی تھی۔ فوراً کچن سے چاقو لے آئے اور باتھ روم کی طرف اشارہ کر رہے تھے لاؤ، حلال کر دیں۔ میں مرغے کو زور سے پکڑے تھا، مرغا کہرام برپا کئے تھا۔ مالتی جی کی حالت بری تھی۔ وہ زور زور سے آنسوؤں سے رو رہی تھیں، نہیں حسن بھائی، پلیز چھوڑ دیجئے۔ حسن بھائی، بہت گناہ پڑے گا، پلیز چھوڑ دیجئے۔ مگر ندا صاحب تھے کہ ان پر جنون سوار تھا کہ جلد سے جلد اس کو حلال کر دوں۔ پھر مالتی جی کے آنسو ہم دونوں کے ارادوں پر حاوی ہو گئے اور ہم نے اس مرغے کو آزاد کر دیا۔

اس کے ایک ماہ بعد فروری کے پہلے ہفتے میں ندا صاحب کا فون آیا کہ میں جشن لکھنؤ کے مشاعرے میں لکھنؤ آنا چاہتا ہوں۔ میں بہت خوش ہوا مگر میں نے کہا کہ ندا بھائی، آپ تشریف لائیں مگر میں اسی دن بڑودہ کے مشاعرے میں رہوں گا لیکن آپ تشریف لائیں اور گھر پر ہی قیام کریں۔ میرا بیٹا حسان آپ کا خیال رکھے گا۔ لیکن ندا صاحب کہنے لگے کہ کوئی ہوٹل کر دو، میں رات رک کے دوسرے دن گورکھپور چلا جاؤں گا۔ میں نے چار باغ میں موہن ہوٹل سے ان کے نام بکنگ کرا دی اور ان کو ہوٹل کا نمبر وغیرہ دے دیا۔ مشاعرے والے دن صبح ابرار کاشف جو جشن لکھنؤ کے مشاعرے کی نظامت کرنے والے تھے، ان کا فون آیا کہ میں لکھنؤ آیا ہوں، آپ کہاں ہیں۔ میں نے کہا، گجرات میں ہوں آج، بولے کوئی بات نہیں حسن بھائی۔ میں گیسٹ ہاؤس میں ہوں۔ میں نے کہا، چلئے پھر ملاقات ہوگی۔ تھوڑی دیر میں ندا بھائی کا فون آیا کہ میں بمبئی ائیر پورٹ پر ہوں۔ دو گھنٹے میں لکھنؤ پہنچ رہا ہوں۔ ہوٹل کیسے پہنچوں گا۔ میں نے ان کو کہا، ندا بھائی، آج ہی کا معاملہ ہے۔ آپ ہوٹل مت رکئے، آپ ابرار کاشف کے پاس چلے جائیے۔ وہ گیسٹ ہاؤس میں آپ کی خدمت میں رہیں گے۔ پھر ابرار کاشف کو میں نے فون کیا کہ یار ندا صاحب ہم سب کے محترم ہیں۔ اکیلے

گھبراتے ہیں۔ آپ ان کو اپنے پاس بلالو۔ رات میں گورکھپور سے گاڑی آئے گی، ان کو رخصت کر دینا۔ ابرار کاشف بہت خوش ہوئے، بولے یہ تو میرے لئے سعادت کی بات ہوگی۔ میرے اس قدم سے ندا صاحب بہت مطمئن اور خوش ہوئے۔ ان دنوں مغربی یوپی میں سردی شباب پر تھی۔ ندا صاحب لکھنؤ سے گورکھپور گئے اور وہاں سے لکھنؤ آئے، ان کو ٹھنڈ زیادہ لگ گئی اور مسلسل سفر کے سبب آرام نہیں ملا۔

خیر، وہ ممبئی پہنچ گئے۔ میں بڑودہ سے لکھنؤ آ گیا اور ندا صاحب کو فون کیا تو مالتی جی نے بتایا، طبیعت بہت خراب ہوگئی ہے۔ ٹھنڈ کھا گئے ہیں، اسپتال میں داخل کیا ہے۔ بڑی تشویش ہوئی۔ میں ۸؍فروری کو مدھیہ پردیش کے شہر ودیشا میں تھا۔ تبھی انور رضوی کا فون آیا کہ ارے حسن بھائی، غضب ہوگیا۔ ندا بھائی کا انتقال ہوگیا۔ مجھے یقین ہی نہیں ہوا۔ میں نے ندا بھائی کا نمبر ملایا مگر وہ بند تھا۔ پھر مالتی جی کو ملایا مگر وہ بھی مسلسل بزی تھا۔ پھر میں نے حسن کمال صاحب کو ملایا مگر ان کو خود خبر نہیں تھی۔ انہوں نے کہا، میں کال کرتا ہوں۔ غرض کہ تھوڑی ہی دیر میں پوری اردو دنیا میں یہ خبر پھیلتے ہی دکھ اور ماتم کا سا ماحول ہوگیا۔ ندا فاضلی کے نہ رہنے سے ہند و پاک کے ادیبوں اور شاعروں میں ایک خلاء پیدا ہوگیا ہے جو شاید کبھی پر نہیں ہوسکتا۔ ایسی ہمہ جہت شخصیت ایسی جگمگاتی چہچہاتی شخصیت تھی ندا فاضلی کی جو ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں میں بیحد مقبول اور محبوب تھی۔ ہمارے مشاعروں کی محفلیں ندا بھائی کی کمی کو شدت سے محسوس کرتی ہیں۔ ندا صاحب کے فن اور شخصیت پر لا تعداد ادیبوں اور شاعروں کی معیاری اور گرانقدر تخلیقات اور تحریریں موجود ہیں اور رہتی دنیا تک تحریر ہوتی رہیں گی۔ ان پر اور ان کے کلام پر خواہ نثر ہو یا نظم ہو، جتنا بھی لکھا جائے کم ہی ہوگا۔ وہ میری نظر میں چلتا پھرتا اسکول تھے، چلتا پھرتا ادب تھے۔ ان کی گفتگو، ان کی بذلہ سنجی کو بھی اگر قلم بند کیا جائے تو وہ وہ بھی ادب کا ایک گرانقدر حصہ ہوگا۔ میرے ان کے جو ذاتی مراسم تھے، یہ ان کی ذرہ نوازی تھی کہ مجھے اپنی محبتوں اور شفقتوں سے بھی نوازتے تھے۔ اب سے تقریباً ۳۵ برس پہلے جب میں ندا صاحب کے گھر رہتا تھا تو اکثر ان کی لائبریری سے شعری مجموعے نکال کر پڑھتا تھا تو وہ مجھے اکثر مشورہ دیا کرتے تھے کہ تم فکشن پڑھا کرو۔ اس وقت یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں ان کو تھوڑی مشکوک نظروں سے دیکھا کرتا تھا کہ یہ مجھے شاعری کی طرف سے فکشن کی طرف کیوں توجہ دلا رہے ہیں مگر جب میں نے فکشن پڑھنا شروع کیا اور میری فکری سوچ میں تبدیلیاں آنے لگیں۔

میری سوچ میں میری فکر میں میری شخصیت میں ندا فاضلی کے اثرات ہیں۔ وہ میرے آئیڈیل ہیں۔ اگر یوں کہا جائے کہ میری شخصیت میں جو بھی خصوصیات ہیں تو وہ ندا بھائی کا پرتو ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ ان کے لئے میرے جو بھی جذبات تھے، میں نے وہ رقم کر دئے۔ میں اپنی بات یہیں ختم کرتا ہوں، ایک مطلع کے ساتھ:

کوئی نشان کوئی نقش پا نہیں ملتا
وہ آس پاس ہے لیکن پتا نہیں ملتا

❑❑❑

'نیا دور' مارچ ۲۰۱۸ء کے شمارہ کے مشمولات

جامعہ ملیہ اسلامیہ سے **صالحہ صدیقی**، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے **ضیاء الرحمن صدیقی**، **شمشاد بی** اور **سید عقیل**، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی سے **نور فاطمہ** اور خواجہ معین الدین چشتی عربی، فارسی، اردو یونیورسٹی سے **منور حسین** کے رپورتاژ جن میں ان اداروں میں اردو کی ادبی فضا اور اردو تہذیب کا احاطہ کیا گیا ہے۔

اردو میں رپورتاژ کی روایت پر ڈاکٹر **طلعت گل** کا مضمون

اس کے علاوہ **مسرور جہاں**، **شموئیل احمد** اور **رینو بہل** کے افسانے

ثناء اللہ ثنا، **سہیل اختر**، **احمد نثار**، **محمد ہارون** وغیرہ کی نظمیں اور غزلیں

مراٹھی ناول 'ایندھن' کی نویں قسط، غیر ملکی ادب، گزشتہ لکھنؤ اور دیگر تخلیقات

ندا فاضلی کی شعری کائنات اور اس کے مخصوص معنوی تلازمات و تعلیقات

زیبا محمود

جدید نقاد اور محقق

سات کتابوں کی مصنفہ

ادبی رسائل میں

مضامین کی اشاعت

فی الحال گنپت سہائے پی جی کالج

سلطانپور میں ایسوسی ایٹ پروفیسر

وطن ٹانڈہ

568، کاشانہ زیب ولا،

گومتی نگر ایسٹ، سلطانپور

رابطہ: 9839222385

۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ ۹۰ ربرس کی مسلسل جدو جہد کے بعد ۱۹۴۷ء میں کامیابی حاصل ہوئی اور ہندوستان باقاعدہ آزاد ہو گیا۔ لیکن یہ آزادی دو بڑے زخم بھی ساتھ لائی۔ پہلا تو یہ کہ ہندوستان دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ اور دوسرا یہ کہ اس تقسیم کے فوراً بعد خونی سیلاب بھی آیا۔ ان خونی واقعات سے نبرد آزما ہو کر جب نئی نسل ابھری تو مذہب، اخلاق اور انسانیت سے اس کا اعتبار اگر مکمل طور پر اٹھ نہیں گیا تو کمزور ضرور ہو گیا تھا۔ ایسی آلودہ اور گھٹن بھری فضا میں نئی نسل ایک ایسے معاشرے اور ایک ایسے سماج کی متلاشی ہو گئی جو تمام تر کثافتوں سے پاک ہو۔ ادب جسے زندگی کا آئینہ کہا گیا وہ بھلا ان اثرات سے کیسے بچ سکتا تھا۔ وہ ترقی پسندی جس نے ہندوستان کی سرزمین پر ۱۹۳۶ء میں حصول آزادی کو اپنا مشن بنایا تھا اور پریم چند نے اپنے صدارتی خطبہ میں باقاعدہ اعلان کیا تھا کہ اب ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ نہ صرف معیار بدلا بلکہ ادب کے تقاضے بھی بدل گئے۔ جب آزادی ملی اور ساتھ میں جو بربادی اور تباہی اور اخلاقی قدروں کی پامالی کا سلسلہ شروع ہو گیا تو فیض جیسے ترقی پسند شاعر نے بھی اس آزادی کو داغ داغ اجالے سے تعبیر کیا۔ نظریات میں تغیر آیا، عقائد میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ خیالات اور احساسات اور تجربات میں ایک انقلاب آیا۔ یہ انقلاب آگیں تبدیلیاں کسی جدید روش کی داغ بیل ڈالنے کا پیش خیمہ ثابت ہونے لگیں۔ لیکن نئی روش یا طے شدہ راہ کو از سر نو ہموار کرنا اور اس پر چل پڑنا کار آساں بھی نہ تھا۔

ہمارے شعراء کا یہ خیال تھا کہ کسی جدید تحریک میں شکست کا سامنا اگر کرنا پڑے تو تنہا نہیں بلکہ اس کا سامنا کرنے کے لئے اس شکست خوردہ تحریک کے ہمنوا بھی ساتھ ہوں۔ چنانچہ حلقہ ارباب ذوق جو ترقی پسندی کے عروج اور شباب کے سائے میں کہیں منظر نامہ سے ہٹ گیا تھا اسی کی جلتی ہوئی مشعل نے ایک بار پھر رہنمائی کی اور جدیدیت کو فروغ دینے کے لئے مختلف تحریکیں اور تنظیمیں وجود میں آگئیں۔ جن کے رجحانات و میلانات شاعری کی جانب بغیر سوچے سمجھے ایک ہی آواز میں ایک ہی انداز فکر کے ساتھ اپنے خیالات پیش کرنے لگے۔ یہ وہ دور تھا جب اشتراکیت اور جدیدیت دو متصادم رویے آمنے سامنے تھے۔ جدیدیت اپنے پاؤں جما رہی تھی اور اشتراکیت کے قدم اکھڑ رہے تھے۔ یہیں یہ اہم سوال بھی اٹھتا ہے کہ ادب نظریات کے تابع ہوتا ہے یا نظریات ادب کے تابع ہوتے ہیں۔ کیونکہ نظریات بدلتے بھی رہتے ہیں

پرانے نظریے فرسودہ ہو جاتے ہیں تو ان کی جگہ نئے نظریات لے لیتے ہیں لیکن ادب کا کارواں رواں دواں رہتا ہے۔ نظریات کو فیشن کے طور پر اپنانے والے شعراء اور ادباء نہ اپنی انفرادیت منوا پاتے ہیں نہ اپنی شناخت قائم کر پاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ دن ان کا سکہ چل جائے لیکن جلد ہی ان کا قلم تھک جاتا ہے ان کے افکار مر جاتے ہیں۔ لیکن جن شعراء نے نظریات کو اپنے مطالعہ، اپنے مشاہدے اور اپنے تجربات کی بھٹی میں پکا کر شعری پیکر عطا کیا وہ زندہ رہتے ہیں۔ زمانہ ان کی قدر کرتا ہے بغیر یہ سوچے کہ شاعر کا شعری اور فکری نظریہ کیا ہے۔ ایسا ہی ایک شاعر اردو کو مقتدیٰ حسن ندا فاضلی کے روپ میں مل گیا جس نے پہلے ہی دن سے انسان دوستی انسانی ہمدردی، محبت، یگانگت، کا پیغام دیا۔ اس کے روح کی گہرائیوں میں میر و غالب کا فکری نظام تھا تو دوسری طرف کبیر کے لہجے کی مٹھاس بھی تھی۔ ندا فاضلی اس لئے اہم نہیں ہیں کہ انھوں نے شاعری میں اس فکر کو پیش کیا بلکہ ندا فاضلی اس لئے اہم ہیں کہ انھوں نے اظہار کا کون سا اسلوب اپنایا:

بات کم کیجے ذہانت کو چھپاتے رہیے
یہ نیا شہر ہے کچھ دوست بناتے رہیے
دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجے رشتہ
دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیے

.....

دھوپ میں نکلو گھٹاؤں میں نہا کر دیکھو
زندگی کیا ہے کتابوں سے ہٹا کر دیکھو

.....

ہر طرف ہر جگہ بے شمار آدمی
پھر بھی تنہائیوں کا شکار آدمی
ہر طرف بھاگتے دوڑتے راستے
ہر طرف آدمی کا شکار آدمی
روز جیتا ہوا روز مرتا ہوا
ہر نئے دن نیا انتظار آدمی
جب کسی سے کوئی گلہ رکھنا
سامنے اپنے آئینہ رکھنا
زندگی کا مقدر سفر در سفر
آخری سانس تک بے قرار آدمی

مذکورہ بالا اشعار بلا کسی تخصیص کے پیش کئے گئے ہیں۔ جو ثابت کرتے ہیں کہ ندا فاضلی نے شعری اسلوب کے لئے کون سا ڈھانچہ تیار کیا ہے۔ جن لوگوں نے ندا فاضلی کو جدیدیت کا پیروکار بتایا ہے وہ یا تو جدیدیت سے واقف نہیں ہیں یا پھر ندا فاضلی کی شاعری کو غور سے پڑھا نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ ندا اپنی تقریروں میں اپنی گفتگو میں خود کو ''جدید یا'' کہتے ہوں لیکن متن اس کی گواہی نہیں دیتا۔ ندا فاضلی اس فنی حقیقت کو خوب سمجھتے ہیں کہ اسلوب موضوع خود منتخب نہیں کرتا بلکہ موضوع اپنا اسلوب چن لیتا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ کون سی بات کس پیرائے میں کہنا چاہئے۔ مذکورہ بالا اشعار میں پہلے تین اشعار میں تخاطب سیدھا اور سپاٹ ہے لیکن اس کے باوجود ندا فاضلی شعریت قائم رکھنے میں کامیاب ہیں۔ اور پہلے شعر میں نرم لطیف سا طنز بھی ہے۔ ان لوگوں کے مزاج پر جو بات بے بات اپنی ذہانت کا ثبوت پیش کرنے سے باز نہیں آئے اور ہر جگہ ان کا یہ مزاج قابل قبول نہیں ہوتا۔ اس لئے مشورہ ہے کہ خود کم بولئے اپنی ذہانت دوسروں پر مت تھوپئے۔ کچھ دوست بناتے رہئے، دوسرا شعر تو ندا کے ضرب الامثال شعروں میں سے ہے یہاں بھی ایک مخلصانہ مشورہ ہے شعری پیکر میں ندا بشیر بدر کے حامی نہیں ہیں جو کہتے ہیں

یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

ندا فاضلی فاصلہ نہیں رکھتے بلکہ دوست بنانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ تیسرے شعر میں بھی تخاطب سیدھا ہے لیکن یہاں مشورہ نہیں ہے بلکہ تجربہ کرنے کی دعوت ہے کہ زندگی کی جو تصویر کتابوں میں پیش کی جاتی رہتی ہے اس سے روبرو ہو کر زندگی کی برہنہ حقیقتوں کو سمجھنے کی کوشش بے سود ہوگی اس کے لئے دھوپ چھاؤں، سردی گرمی سب برداشت کرنا پڑے گی۔ جو زندگی کے ان پہلوؤں اور زاویوں سے روبرو نہیں ہے وہ زندگی کی ایک بڑی سچائی سے ناواقف رہ جاتے ہیں۔ آپ چاہیں تو اس شعر میں ترقی پسندی اور سوشلزم بھی تلاش کر سکتے ہیں اور مزدور کا پسینہ بھی تلاش کر سکتے ہیں۔ بھوک اور افلاس بھی تلاش کر سکتے ہیں اور ذرا وسعتِ نظر کا مظاہرہ کریں تو مکمل انسانی زندگی کا آئینہ بھی آپ کو صاف نظر آجائے گا۔ چوتھے پانچویں چھٹے اور ساتویں شعر میں سیدھا تخاطب کوئی نہیں ہے خود کلامی کے اس انداز میں انسانیت کا المیہ بیان کیا جا رہا ہے۔ یہاں بھیڑ کا بھی تذکرہ ہے اور تنہائی کا بھی۔ یہ وہ کیفیت ہے جو آزادی کے بعد انسانی زندگی ترقی کے راستوں پر تیزی سے چل پڑی ہے۔ ہر شخص دوڑنا بھاگنا چاہتا ہے۔ تمام تر ترقیات کے حصول کے بعد بھی سکون، چین اور راحت کی سانسیں نصیب نہیں۔ ندا فاضلی کا یہ آدمی نامہ نظیر اکبر آبادی کے آدمی نامہ کی توسیع بھی ہے اور تکمیل بھی۔ جہاں سب کچھ حاصل کرنے کے بعد آخری سانس تک کچھ پا لینے کا انتظار آنکھوں میں ہے۔ متن ہی سے یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ ایسا کیوں؟ اور پھر جواب کے لئے مذہب، فلسفہ، تاریخ اور عمرانیات و سماجیات معاشیات و سیاسیات کا جائزہ لیجئے شاعر خود کوئی حل پیش نہیں کر رہا۔ یہ سوال بھی اہم ہے بلکہ حل تلاش کرنے کی سب کو دعوت دے رہا ہے۔ اسی لئے ان اشعار کا کینوس وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ ندا فاضلی کے یہاں یہ وژن کہاں سے اور کیسے آیا۔

مقتدیٰ حسن ندا فاضلی آزادی سے ۹ برس پہلے دہلی میں مقیم ایک کشمیری گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بھی اردو میں شعر کہا کرتے تھے۔ حصول تعلیم کی غرض سے ندا کا داخلہ گوالیار کے ایک اسکول میں کرا دیا گیا کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ندا فاضلی کا گذر ایک

مندر کے پاس سے ہوا جہاں کوئی مغنی سورداس کا بھجن گا رہا تھا۔اس بھجن میں رادھا شری کرشن کے فراق میں اپنی کیفیت اپنی سہیلیوں سے بیان کر رہی تھی۔ندا اس آواز اور بھجن کو سن کر وہیں رک گئے ندا کے حساس دل پر اس خوبصورت حسن کا گہرا اثر ہوا اور وہیں سے ان کے اندر شعر گوئی کی تحریک پیدا ہوئی۔جس کی بازگشت ندا کے پورے شعری منظرنامے پر صاف نظر آتی ہے۔ خواہ وہ غزل ہو یا نظم یا دوہے۔

۱۹۶۴ء میں ندا نے بمبئی کا رخ کیا۔شروع میں وہ ہندی میگزین دھرم یگ اور اردو ہندی اخبار 'بلٹز' میں لکھتے رہے ان کی شرکت اسی دوران مشاعروں میں بھی ہونے لگی تھی۔ان کے منفرد لب ولہجہ اور ممتاز آواز نے اردو اور ہندی دونوں زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ان کے دل کی گہرائیوں میں رادھا اور میرا کے بھجن تھے وہ کبیر اور سورداس سے بھی متاثر تھے۔ان کے مطالعہ میں میر وغالب کے علاوہ ٹی،ایس، ایلیٹ انٹونی چیخوف گول اور گورکی بھی آئے ان کی تحریروں نے ندا کے افکار میں مزید جلا پیدا کی۔ندا نے اپنے شعری اظہار کے لئے عربی فارسی کے اثر سے آزاد وہ زبان اور لہجہ اختیار کیا جس میں ہندوستانی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو رچی بسی تھی۔اگر چہ یہ لہجہ خدائے سخن میر کے یہاں بدرجہ اتم موجود ہے۔لیکن پوری طرح سے نہیں۔میر کی زبان میں رنگا رنگی ہے تنوع ہے۔ندا کے یہاں ان کا خالص ہندوستانی لب ولہجہ پورے شعری منظرنامہ پر بہا نگ دہل سنائی دیتا ہے۔جس میں سادگی تو ہے مگر گہرائی بھی۔ان کے ہاں سادگی میں سطحیت نہیں ہے:

ہر گھڑی خود سے الجھنا ہے مقدر میرا
میں ہی کشتی ہوں مجھی میں ہے سمندر میرا
ایک سے ہو گئے موسم کے یہ چہرے سارے
میری آنکھوں سے کہیں کھو گیا منظر میرا
آئینہ دیکھ کے نکلا تھا میں گھر سے باہر
آج تک ہاتھوں میں محفوظ ہے پتھر میرا
نہ جانے کون سے لمحے کی بد دعا ہے یہ
قریب گھر کے رہوں اور گھر نہ جاؤں میں

.....

اپنی مرضی سے کہاں اپنے سفر کے ہم ہیں
رخ ہواؤں کا جدھر ہوگا ادھر کے ہم ہیں

.....

وقت کے ساتھ ہے مٹی کا سفر صدیوں تک
کس کو معلوم کہاں کے ہیں کدھر کے ہم ہیں

خود ہی کشتی اور خود ہی سمندر ہونا اور ہر گھڑی خود سے الجھتے رہنے کو مقدر کہنا ذات کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ اور کشمکش کا منظرنامہ پیش کرتا ہے جو نظریاتی طور پر جدیدیت کا غالب لہجہ گردانا جاتا ہے۔ساتھ ہی اپنی ذات سے الجھتے رہنے کو مقدر مان لینا شکست کی علامت بھی ہے کہ مقدر بدلا نہیں کرتے۔موسموں کے چہروں میں یکسانیت کا ہونا موسموں کی شناخت مفقود ہو جانے کی کہانی ہے اور آنکھوں سے منظر کا کھو جانا بھی اسی شکست کی علامت ہے جو پہلے شعر میں مضمر ہے۔تیسرے شعر میں یہ احساس بدلا ہوا ہے اب یہاں وہی بات ہے جو کبیر کے مشہور دوہے میں کہی گئی کہ برا جو دیکھن میں چلا برا نہ ملیا کوئے۔جب آئینہ دیکھیں تو وہ پتھر ہاتھوں میں ہی محفوظ رہ گیا۔ جو دوسروں پر پھینکنے کے لئے ہاتھوں میں اٹھایا تھا۔ ہاتھوں میں آج تک محفوظ رہ جانا ایک تسلسل کو پیش کرتا ہے جو شعر کو زمانی وسعت عطا کر دیتا ہے۔چوتھے اور پانچویں شعر کو دیکھیں۔گھر کے پاس رہ کر بھی گھر نہ جانا ظاہر ہے کہ یہ کسی طرح کی بدعا ہی ہو سکتی مگر یہ گھر کون سا ہے اپنا ذاتی گھر یا وہ کرب جو تقسیم ہند نے مہاجرین اور مقیم دونوں کے دلوں میں پیدا کر دیا تھا۔پھر اپنی کشتی حیات کو ہواؤں کے رخ کی محتاج قرار دینا اختیار و جبر کے فلسفہ کا مظہر ہے جس پر نہ معلوم کتنے ہی صفحات سیاہ کئے جا چکے ہیں مگر اب تک اس راز سے پردہ نہ اٹھ سکا کہ اختیار کیا ہے اور جبر کیا اور اختیار کہاں ختم ہوتا ہے جبر کہاں سے شروع ہوتا ہے۔اس شعر میں ندا فاضلی انسان کو اس ازلی جبر کا شکار کہنا چاہتے ہیں جب اللہ رب العزت نے آدم خاکی کی تخلیق کی تھی۔ یہاں بھی ہمیں یہ مشہور شعر یاد آتا ہے:

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

اور آخر الذکر شعر میں بھی ایک بار شکست خوردگی کا بیان اور زندگی کو ایک ناسمجھ میں آنے والے معمہ سے تعبیر دینے کی کوشش ہے یہ خاکی صدیوں سے سفر میں ہے اور یہ آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں سے آئے ہیں اور کدھر جاتا ہے ندا کے اس طرح کے اشعار اسلامی فلسفۂ حیات سے تضاد رکھتے ہیں کیا ندا ذاتی طور سے بھی مذہب اور مذہبی امور و احکام سے متصادم اور متضاد رویوں کے حامل ہیں۔یہ سوال اٹھایا بھی جا سکتا ہے اور نہیں بھی۔کہ شاعری مذہب سے الگ چیز ہے ورنہ سرکار دو عالم نے امرو القیس کو اشعر الشعراء نہ کہا ہوتا۔شاعری اپنے آپ میں ایک الگ دنیا ہے شاعر مختلف موڈ میں مختلف تجربات و احساسات کی ترجمانی کرتا ہے کبھی ذات کو کائنات کے پیرائے میں بیان کرتا ہے اور کبھی کائنات کو ذات میں سمو کر پیش کرتا ہے۔شاعری میں ایک ربط اور تسلسل کا ہونا غیر فطری ہے۔لیکن لہجہ اور اسلوب اظہار جس کا دار و مدار زبان و بیان پر ہے ایک ارتقائی سفر طے کر کے مستحکم ہو جاتا ہے۔اور یہی شاعر کی شناخت ہوا کرتی ہے۔ بحیثیت شاعر ندا فاضلی ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء دہائی کے بعد ابھرنے والے شعراء میں اپنی مخصوص فکر اپنے مخصوص اسلوب اپنی مخصوص زبان کی بنیاد پر اہم مقام و مرتبہ کے حامل ہیں۔نئی شاعری یا جدید شاعری کی تاریخ ندا فاضلی کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔

❑❑❑

ندا فاضلی کی جدید ترین اردو شاعری اور اس کے امتیازی پہلو

عائشہ ضیاء

'مکاتیب محمد حسین آزاد

کا تجزیاتی مطالعہ'

کے موضوع پر جواہر لال نہرو یونیورسٹی،

سے ایم فل، پی ایچ ڈی کی تیاری

ناصر لائبریری،

ابو بازار، گورکھپور

رابطہ: 9013248707

ندا فاضلی جدید اردو شاعری کا اہم نام ہے۔ ندا کا شعری سفر پچاس سالوں سے متجاوز ہے۔ انسانیت دوستی، خود اعتمادی، جہد مسلسل اور عمل پیہم ندا کی موضوعاتی ترجیحات میں شامل ہیں اور ایک طرح سے ندا کی زندگی بھی انھیں اوصاف کا آئینہ ہے۔ ندا فاضلی ۱۹۳۸ء میں گوالیار میں پیدا ہوئے۔ ۸ فروری ۲۰۱۶ء میں ممبئی میں ان کا انتقال ہوا، ان کی پیشہ ورانہ وابستگی نغمہ نگاری سے تھی تخلیقی میدان میں سوانحی ناول، نظم اور غزل کو انھوں نے اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ شاعری میں ''لفظوں کا پل''، ''مور ناچ''، ''آنکھ اور خواب کے درمیان''، ''کھویا ہوا سا کچھ''، ''شہر میرے ساتھ چل''، ''زندگی کی طرف''، ''شہر میں گاؤں'' ان کی یادگاریں ہیں۔

فی الوقت ہمیں ندا کی غزل گوئی پر گفتگو کرنی ہے۔ ندا کی غزلیات کا رنگ و آہنگ جدید غزل میں نمایاں اور منفرد مقام رکھتا ہے۔ ہم عصر شعرا کے مابین جو وصف ندا فاضلی کو شرف امتیاز سے ہم کنار کرتا ہے وہ ان کا سلیس، آسان اور زمین سے جڑا ہوا طریق اظہار ہے۔ وہ فکر و خیال اور حرف و لفظ کی دونوں سطحوں پر اپنے آپ کو جوڑ کر چلتے ہیں۔ اگر ایک طرف ان کی عقل کی سرحد میں غالب کا تشکیکی رویہ داخل ہوتا ہے تو دوسری طرف ان کے یہاں کبیر کی ظاہر داری کے مخالف روش کا پرتو بھی صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ ندا فاضلی کی غزلوں کو ادوار کے حساب سے بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ان کی جد و جہد کا اولین زمانہ انارکیت کی طرف ان کے میلان کو ظاہر کرتا ہے اور رفتہ رفتہ اس لہجے میں کمی آتی ہے اور وہ اپنا رخ انسان کی داخلی کشمکش، سماج کی بیرونی تبدیلی اور صنعتی تہذیب کے نئے اثرات کی طرف موڑ لیتے ہیں۔ ان کے یہاں دھیرے دھیرے کائنات کا ارضی پہلو بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔ زندگی کے نئے وسائل، قدرتی ذخائر کی دریافت، اس کے نت نئے استعمال سے پیدا ہوئی سہولیات اور اس کے نتیجے میں ظاہر ہونے والی ہمہ گیر تبدیلی، بدلتی تہذیب و ثقافت میں انسانی رویے کے تغیر و اثر پذیری کو بھی وہ اہمیت دیتے ہیں۔

جدید صنعتی نظام کے برپا ہونے کے بعد نمائشی تہذیب کی آرائشی سرگرمیوں نے فضا و ماحول کو جس ابتری تک پہنچایا، تہذیبی زندگی کی بدلتی قدروں نے رہن سہن، نشست و برخاست، آمد و رفت کپڑا و پوشاک، مکان و دکان اور لب و لہجے تک کو جس طرح متاثر کیا، ندا فاضلی نے ان تبدیلیوں کو بطور خاص اپنا موضوعِ سخن بنایا۔

احساس ، خیال، جذبے اور انسانی رویے کی سطحوں پر جو بات محسوس کی، اس کا شعری اظہار ضروری سمجھا۔ زبان اور لفظیات کی سطح پر بھی ندا فاضلی نے الگ روش اپنائی۔ ان کے یہاں کلاسکیت کا رچاؤ بھی ہے اور جدت کا رنگ بھی۔ عرفان صدیقی، محمد علوی اور ظفر اقبال وغیرہ کے برعکس ڈکشن کے معاملے میں ندا فاضلی لوک ادب اور ہندی شاعری سے بھی کسب فیض کرتے ہیں۔ یہ وصف نہ صرف انھیں امتیازی شان عطا کرتا ہے بلکہ ان کی غزلوں کو ارضیت کے مختلف رنگوں اور زمینی تہذیب وثقافت کے کئی رویوں سے مالا مال بھی کرتا ہے۔ ندا کے یہاں آغاز شاعری میں اپنے عہد کے سیاسی حالات، فرقہ واریت سے دلبرداشتگی اور مذہب کے استحصال سے جو ردعمل سامنے آیا، اس کی گونج ان کے یہاں اخیر عمر تک سنائی دیتی رہی۔ وہ غالب کے تشکیکی اور ظریفانہ طرز اظہار سے آگے بڑھ کر تعقل کی سرحد میں داخل ہوتے اور کہتے ہیں ؎

جو ہوتا رہا ہے وہ ہوتا رہے گا
خدا حسب معمول سوتا رہے گا

.....

میرے کمہار ہو جو اجازت تو یوں کہوں
پھر سے مجھے بنا نئے سانچے میں ڈھال کر

.....

تمام تر حوادث، ہنگامہ آرائی اور بھونچال کے باوجود زندگی اپنی رفتار سے چلتی رہتی ہے اور تماشائے عالم جاری رہتا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

یہ اسٹیج خالی نہیں ہونے والا
تماشا بہر حال ہوتا رہے گا

انسان کی سائنسی ترقی اور اس کی تعقلاتی سرگرمی جس سماجی وتہذیبی منظرنامے کی تشکیل کا موجب بنی، اس نے طرز رہائش اور دن رات کی قید کو بھی متاثر کیا، کام کے اوقات بھی تبدیل ہوئے، معیار اور پسند و ناپسند کا مزاج بھی بدلا۔ عمارت کے نقشے بھی تبدیل ہوئے۔ دیگر حیوانات سے انسانی رابطہ پر اثر پڑا۔ اختصاص کی وبا نے چیزوں کو ماہرین کے ساتھ خاص کرنا شروع کر دیا۔ شاعر نے اس تبدیلی کو جس طرح دیکھا اور اس سے متاثر ہوا، اس کا اظہار یوں کرتا ہے:

نہ چھتری اس میں چڑیوں کی، نہ کمرہ ہے کتابوں کا
عمارت ساز یہ نقشہ مرے گھر کا نہیں لگتا
مداری کی صدا اپنی کشش کھونے لگی شاید
پرانے شعبدوں سے اب نیا مجمع نہیں لگتا

.....

ندا فاضلی کی لفظیاتی وموضوعاتی انفرادیت پر گفتگو کرتے ہوئے وارث حسین علوی اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:

''ندا جدید شاعر ہے۔ جدید غزل کی وہ شاہراہ جس پر ظفر اقبال، محمد علوی، بشیر بدر، عادل منصوری، بمل کرشن اشک اور دوسرے شعرا غزل خواں کم اور پابہ جولاں زیادہ چلے۔ اس پر سب سے بڑا اشتہار ندا کے اس مرغ کا ہے جو سورج کو چونچ میں لئے کھڑا ہے۔ لیکن یہ اشتہار محض التباس ثابت ہوا۔ ندا نے کمرے کے پردے کھینچ لئے اور رات ہوگئی۔ غزل پھر پردہ نشیں ہوگئی، جس سے ندا باتیں کرنے لگا۔''

انسانوں کی ترقی یافتہ دنیا اور مہذب سماج نے انسانی حسیات اور اس کی داخلی کائنات کو کسب معاش کے وسائل سے بھی متاثر کیا۔ وہ اس طرح کہ روزی روٹی کے وسائل کو شہروں میں وافر کر دیا۔ انسان اپنی مقامی زمین سے دور جا بسنے پر مجبور ہوا۔ شہروں میں کسب معاش کا مسئلہ تو ضرور حل ہوا لیکن اپنے دیس اور بھیس کی خوشبو کا فقدان اسے ستاتا رہا۔ اس نے بند پنجروں کے پرندے دیکھے تو اسے پیڑوں اور جنگلوں میں پھدکتی چڑیوں کی یاد آئی۔ شاعر کی رگِ حس دیکھئے کہ وہ کتنے بڑے المیے کو قلمبند کر رہا ہے:

جنگل سے محفوظ تھا پنجرہ لیکن اسی حفاظت میں
کھلی فضا کا ایک پرندہ پروں سے اُڑنا بھول گیا
بھٹک رہا ہے تنہا تنہا انجانوں کی بستی میں
شاید اپنے ساتھ وہ اپنے شہر کو لانا بھول گیا

ندا کی شاعری کا ایک اہم وصف ان کا ماحولیاتی لگاو اور شعور بھی ہے۔ ایسے اشعار کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ذہن و دماغ ہی نہیں سارے حواس کائناتی مظاہر سے معاملہ کرنے اور انھیں اپنی حسیات کا حامل بنانے میں کوتاہی نہیں کرتے، اسی لئے وہ ہوا، دھوپ اور بادل میں اپنی مٹی کے رنگ بدلتے رہتے ہیں۔ ماحولیات کے دائرۂ بحث میں زمان ومکان بھی لامحالہ ہیں کہ زمین سے مکان کا تصور ہے تو سورج اور زمین کی گردش سے وقت کی تحدید:

ہوا میں، دھوپ میں، بادل میں ڈھلتا رہتا ہوں
میں مشت خاک ہوں چہرے بدلتا رہتا ہوں
مرے سفر میں نہیں قید رات اور دن کی
میں وقت کی طرح ہر وقت چلتا رہتا ہوں

.....

اُڑ جائے نہ پرندہ قفس توڑ تاڑ کے
پینے کو پانی چگنے کو دانا نہیں رہا
جنگل میں راستے بنے آبادیاں بڑھیں
بس صبح و شام چڑیوں کا گانا نہیں رہا

اسی پر بس نہیں بلکہ اسے اپنے تنفس کی بھی فکر ہے۔ وہ سیلاب کے خاتمے اور نتائج پر غور کر رہا ہے تاکہ اس کی قہرسامانیوں میں ضائع ہوئے درختوں کو ان کا وارث دے سکے جو اس زمین کو گلزار اور اس کی فضا کو صاف شفاف رکھیں تاکہ انسانی سانسیں اس سے زندگی کا صحت مند پانی پیتی رہیں۔ کہتے ہیں:

سیلابوں کو رخصت کر
تجھ کو پیڑ اُگانا ہے

دریا کی طغیانی، ریگستان اور صحرا کی ہولناکی اور چاندو رات کو ایک دوسرے کے ساتھ کیسے ہم آمیز کیا ہے، دیکھئے:

دیکھ کنارا پاس نہ ہو

دریا میں طغیانی ہے
لے کر ساتھ کھجوریں چل
رستہ ریگستانی ہے
چاند ہے بچوں کا ماموں
اجلی رات ممانی ہے

احساس ذات اور عرفان ذات و کائنات کے حوالے سے جو پہلو ندا کے یہاں قابل تعریف ہیں، وہ یہ کہ وہ اپنے تجربوں پر اعتماد کرنے کے قائل ہیں۔

زندگی سہل ہو، بات بنی بنائی، ڈگر بالکل واضح اور نشان قدم اوروں کے اس پر چمکتے ہوں، پھر بھی انھیں اپنا تجربہ و مشاہدہ اور اس سے دریافت کی گئی دنیا عزیز ہے۔

وہ دوسرے کے تجربے پر قناعت کرنا پسند نہیں کرتے بلکہ ان تجربوں سے انحراف کر کے نئے تجربوں سے گزر کر عرفان کی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

اپنی تلاش، اپنی نظر، اپنا تجربہ
رستہ ہو چاہے صاف بھٹک جانا چاہئے
بجلی کا قمقمہ نہ ہو، کالا دھواں تو ہو
یہ بھی اگر نہیں تو بُجھ جانا چاہئے

انسانی ذات کے اصل جوہر کی قدردانی اس کے جیتے جی نہیں ہوتی۔ ایک شاعر اپنی روح کی پوٹلی میں حسّ کا نازک جسم لے کر آتا ہے۔ وہ جسم اس قدر چوٹ کھاتا ہے کہ درد و کرب میں ڈھل کر الفاظ کو ایسا پیرہن عطا کرتا ہے جس پر ذوق جمال کی رگیں پھڑکتی ہیں اور صدیوں پھڑکتی رہتی ہیں لیکن اس عمل کو انجام دینے میں شاعر یا صاحب احساس پتھر ہو جاتا ہے۔ بظاہر صحیح نظر آنے والا اپنی شخصیت کا سِرا تفکرات کے گھنے جنگل میں کھو دیتا ہے۔ اس کا سکوت لوگوں کے لئے تمکنت کی علامت بن جاتا ہے۔ شور و شغب کے بیچ اس کی آواز پر کان نہیں دھرے جاتے:

مجھ سے مجھے نکال کے پتھر بنا دیا
جب میں نہیں رہا ہوں، تو پوجا گیا ہوں میں
اوپر کے چہرے مہرے سے دھوکا نہ کھایئے
مجھ کو تلاش کیجئے، گم ہو گیا ہوں میں

.....

منھ کی بات سنے ہر کوئی، دل کے درد کو جانے کون
آوازوں کے بازاروں میں خاموشی پہچانے کون

ندا کی غزل دیگر کئی مقامات پر کلاسیکی موضوعات سے انحراف کرتی ہے۔ وہ موت کے سامنے نہ تو سپر ڈالتی ہے اور نہ ہی اپنے عہد کے نفاق کو خلوص کا رنگ دیتی ہے۔ زندگی پر پہرے کو اور خواب پر شب گوں کو گوارا نہیں کرتی۔ وہ ظاہر پر نہیں جاتی اور نہ ہی وہ زندگی میں کامیابی کی منزلوں کا شمار کرتی ہے۔ بلکہ وہ سکون، اطمینان اور حسن و آرام کی متلاشی ہے اور اسی کی ترغیب دیتی ہے:

تلاش جب بھی کیا کیجئے ہم نشینوں کو
الٹ کے دیکھ لیا کیجئے آستینوں کو

.....

خدارا کوئی کہے وقت کے لٹیرے سے
وہ مجھ کو لوٹے مگر میرے خواب رہنے دے
یہ دیکھ چین سے بستر کسے سلاتا ہے
ہے کون کتنا یہاں کامیاب رہنے دے

.....

یاروں کی آستینوں سے اب جھانکتے ہیں سانپ
شاید زمیں میں کوئی خزانہ نہیں رہا

ہم نے مندرجہ بالا مثالوں میں دیکھا کہ ندا اگر بت ہزار شیوہ نہیں تو نہ سہی لیکن یک رنگ و یک رخا بھی نہیں ہے۔ ہم عصر عہد کی حسیت اور اس کے پورے سیاق و سباق کو تمام تر تخلیقیت کے ساتھ لفظ میں کشید کرنے کا عمل ان کے یہاں جا بجا ملتا ہے۔ وہاں ایک فرد پریشان بھی ہے اور ایک ذہن سیال بھی، زندگی کا جویا بھی ہے اور سکوت کا عادی بھی، تنہائی میں گم اور محفل میں براجمان بھی۔ آستینوں کے سانپوں کو دیکھتا ہے۔ سینوں کے خلوص کو پہچانتا ہے۔ گاؤں اور کھیت کھلیان کی بات بھی کرتا ہے اور بدلتے ماحولیات کے مضمرات کو نشان زد بھی کرتا ہے۔ فضا کا یہ غزلیہ اظہار اپنے آپ میں ایک بڑا تجربہ ہے:

پردیسی سونی آنکھوں میں شعلے سے لہراتے ہیں
بھابی کی چھیڑوں سے بادل، آپا کی چٹکی سا چاند

.....

بچوں سے ہمکتی شب، گیندوں سے اچھلتے دن
چہروں سی دھلی خوشیاں، بادلوں سی کھلی الجھن

.....

قید تھے سورج میں بادل گاؤں کے
منتظر تھے کھیت ساون کے لیے

متذکرہ بالا مثالوں سے پتہ چلتا ہے کہ ندا لوک ادب، ہندی کلاسیکی سرمایے کی روح اور اردو کی روایت کو ہم آمیز کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ اور اسی ہنر نے ان سے دیہی تصویر کے یہ نمونے ترشوائے ہیں۔ دیہی احساس و فضا سے لبریز غزلوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ندا، تمام مقامات پر غزل کے ایک شعر کی خود مکتفی حیثیت کو باقی رکھنے میں کامیاب نہیں ہیں بلکہ غزل مسلسل کا تاثر دیتے ہیں۔ بعض مقامات پر انھیں کامیابی بھی ملی ہے جیسا کہ آخر الذکر شعر میں ہوا ہے۔ نتیجے کے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ندا فاضلی جدید اردو غزل کے منفرد، ممتاز اور لائق تقلید شاعر ہیں۔ جیسے جیسے ملک میں جمہوری قدریں سفلی جذباتی تصور تہذیب پر غالب آتی جائیں گی ویسے ویسے اس شاعر کے فکر و نظر اور شعری تجربہ و عمل کے سروکار روشن ہوتے چلے جائیں گے:

جتنی بری کہی جاتی ہے اتنی بری نہیں ہے دنیا
بچوں کے اسکول میں شاید تم سے ملی نہیں ہے دنیا

❑❑❑

بشیر بدر

غزل

یاد اب خود کو آرہے ہیں ہم
کچھ دنوں تک خدا رہے ہیں ہم

آرزوؤں کے سرخ پھولوں سے
دل کی بستی سجا رہے ہیں ہم

آج تو اپنی خامشی میں بھی
تیری آواز پا رہے ہیں ہم

بار کیا ہے کہ پھر زمانے کو
یاد رہ رہ کے آ رہے ہیں ہم

جو کبھی لوٹ کر نہیں آتے
وہ زمانے بلا رہے ہیں ہم

زندگی اب تو سادگی سے مل
بعد صدیوں کے آرہے ہیں ہم

اب ہمیں دیکھ بھی نہ پاؤگے
اتنے نزدیک آرہے ہیں ہم

غزلیں اب تک شراب پیتی تھیں
نیم کا رس پلا رہے ہیں ہم

دھوپ نکلی ہے مدتوں کے بعد
گیلے جذبے سکھا رہے ہیں ہم

فکر کی بے لباس شاخوں پر
فن کی پتی لگا رہے ہیں ہم

سردیوں میں لحاف سے چمٹے
چاند تاروں پہ جارہے ہیں ہم

زیست کی ایک برقی لڑکی کو
'نورنامہ' پڑھا رہے ہیں ہم

اس نے پوچھا ہمارے گھر کا پتہ
کافی ہاؤس بلا رہے ہیں ہم

کندھے اچکا کے بات کرنے میں
منفرد ہوتے جارہے ہیں ہم

چست کپڑوں میں جسم جاگ پڑے
روح و دل کو سلا رہے ہیں ہم

کوئی شعلہ ہے کوئی جلتی آگ
جل رہے ہیں جلا رہے ہیں ہم

ٹیڈی تہذیب، ٹیڈی فکر و نظر
ٹیڈی غزلیں سنا رہے ہیں ہم

۱۹۶۰-۶۱ء

انتظار حسین کے نام جنہوں نے ادب لطیف، لاہور میں اس غزل کو دو صفحوں پر چھاپا تھا اور یوں ہمت بڑھائی تھی 'اپنی حفاظت کرو تو اس عہد میں منفرد شاعر ہو'

غزل

میں نگار فکر و نگاہ کو کبھی بھول کر بھی صدا نہ دوں
یہ عجیب شرطِ وفا ہوئی کہ جو تم کہو میں وہی کہوں

کئی اجنبی تری راہ میں مرے پاس سے یوں گزر گئے
جنہیں دیکھ کر یہ تڑپ ہوئی ترا نام لے کے پکار لوں

مری آرزو ہے کہ ایک رات بس ایک چاندنی رات میں
میں خموش برف کی وادیوں کی اداس بانہوں میں سو رہوں

یہ ہوا نہ جانے کہاں کہاں بھری دوپہر میں لئے پھرے
مرے برگ دل ذرا ٹھہر جا تجھے آنسوؤں سے میں سینچ لوں

کسی مصلحت سے بہار خود مرے لب کے پاس ٹھہر گئی
مری آرزو تھی خزاں کے خشک، اداس ہونٹوں کو چوم لوں

یہ سفید پھول کی چادریں نم شبنمی کا بنا کفن
مجھے کچھ نہ دو یہیں رہنے دو کہ اسی گلی کی میں خاک ہوں

میں تو آنسوؤں کا سکوت ہوں لب شعر مجھ کو صدا نہ دے
نہ کبیرؔ ہوں، نہ نظیرؔ ہوں، نہ میں میرؔ ہوں نہ بشیرؔ ہوں

بشیر بدر اردو شاعری کا ایک اہم نام: کچھ یادیں کچھ باتیں

شاعر فتح پوری

معروف کہنہ مشق شاعر
جگر مرادآبادی کے ارشد تلامذہ
میں شامل، چھ شعری مجموعوں
کے بعد، کلیات کی بھی اشاعت
جگرا کادمی کے روح رواں
اور مشاعروں کا معتبر نام
مختلف اعزازات سے سرفراز
وطن فتح پور

۸۸/۸۹، چمن گنج، کانپور
رابطہ: 9935416865

بشیر بدر اردو شاعری کا بڑا نام، قدیم وجدید نظم ونثر سارے میدانوں میں ثروت مند، مجھے یاد آتا ہے کہ ان سے میرا تعارف سب سے پہلے ۱۹۵۰ میں ہوا تھا گویا کم وبیش ستر سال پہلے ظاہر ہے کہ وہ ہم دونوں کا ابتدائی زمانہ تھا وہ ان دنوں فتح پور کے اینگلو کالج میں پڑھتے تھے اور میری تو آبائی زمین ہی فتح پور ہسوہ ہے۔ بشیر بدر کے والد محکمہ پولیس میں خزانچی تھے۔

مجھے یاد ہے کہ جب ان کے والد کچھ ذہنی عارضہ میں مبتلا ہو گئے تھے تو دفتر میں ان کا کام بشیر بدر ہی دیکھا کرتے تھے۔ تعلیمی کی حصولیابی کے دوران ہی بشیر بدر کو دفتری ذمہ داریوں سے بھی نپٹنا پڑ رہا تھا اور یہ ان کی جوانی کا بھی دور تھا۔ والد کی بیماری، گھر کی ذمہ داری، پڑھائی اور جوانی! بشیر بدر نے ان سب کو بخوبی نبھایا۔

والد جب ریٹائر ہوئے تو بشیر بدر الہ آباد چلے گئے۔ الہ آباد یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے لگے میں ۱۹۵۱ کے بعد میں کانپور چلا آیا تھا جہاں میرے بڑے بھائی جلیل فتحپوری پہلے ہی سے موجود تھے اور میں یہیں تعلیم حاصل کرنے لگا۔ بشیر بدر نے مجھے بتایا تھا کہ ان کی پیدائش کانپور کی ہی ہے غالب خیال ہے کہ ان کے والد بسلسلۂ ملازمت کانپور میں رہے ہوں گے بہرحال بعد میں بشیر بدر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے لگے پھر میرٹھ یونیورسٹی میں پروفیسر ہو گئے، انہوں نے مجھے میرٹھ کے مشاعرے میں بلایا بھی تھا کانپور اور فتح پور کے بیشتر مشاعروں میں میرا ان کا ساتھ رہا اسی زمانے میں جب وہ فتح پور میں تھے انہوں نے اپنا ایک شعر مجھے سنایا تھا جو آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔

آج کی رات اس لئے تو نہ تھی
آج کی رات اور خاموشی

برسوں پہلے جب میرے مجموعہ کلام ''تیر نیم کش'' کی تقریب اجرا کانپور میں منعقد ہوئی تو میں نے انہیں مدعو کیا تھا وہ ان دنوں علی گڑھ میں تھے تقریب اجرا میں شریک ہوئے میرے بارے میں دل نشیں باتیں کیں اور میری شاعری کی بھی تعریف کی ان کا طویل قیام میرٹھ میں رہا کچھ برسوں پہلے انہوں نے بعض حالات کی بنا

پر میرٹھ چھوڑ دیا تھا اور بھوپال چلے گئے تھے اب وہیں مقیم ہیں ہم دونوں ہی اب عمر کی ان منزلوں میں ہیں کہ ملاقات کا امکان بہت کم ہے لیکن ان کی شاعری میں پڑھتا رہا ہوں مجھے ان کی شاعری اچھی لگتی ہے۔ کچھ شعر میرے حافظے میں ابھی بھی موجود ہیں:

دونوں کو تشنہ مار رہا ہے کوئی یزید
یہ زندگی حسین ہے اور میں فرات ہوں

.....

مری غزل کی طرح اس کی بھی حکومت ہے
تمام شہر میں وہ سب سے خوبصورت ہے

.....

اس کی زلفیں بہت گھنیری ہیں
ایک شب کا قیام اور سہی

.....

بہت سے لوگ دل کو اس طرح محفوظ رکھتے ہیں
ہزاروں بارشوں میں بھی یہ کاغذ نم نہیں ہوتا

.....

بھری برسات میں شاداب بیلیں سوکھ جاتی ہیں
ہرے پیڑوں کے گرنے کا کوئی موسم نہیں ہوتا

ان اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم وجدید شاعری میں بشیر بدر نے کس طرح سے اہم مقام حاصل کیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میری اور بشیر بدر کی ملاقات جواب تک کی آخری ملاقات ہے ۱۴/اپریل ۲۰۱۰ء کو ممبئی میں ہوئی تھی جہاں ایک ادبی تقریب میں مجھے آئیڈیل انڈیا ز ایوارڈ سے نوازا گیا۔ یہ تقریب بشیر بدر کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی۔ اس موقع پر ایک عظیم الشان مشاعرہ بھی ہوا۔ کم وبیش سات سال ہو چکے ہیں میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی ہے میری خواہش ہے کہ وہ ہمیشہ صحت مند وخوش خرم رہیں میں اس موقع پر ان کی خوش اخلاقی اور بصیرت کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ شعر پیش کرنا چاہتا ہوں۔

جن سے مل کر زندگی سے پیار ہو جائے وہ لوگ
آپ نے دیکھے نہیں ہوں گے مگر ایسے بھی ہیں

میں محسوس کرتا ہوں کہ بشیر بدر ایک حقیقی شاعر ہی نہیں بلکہ زندگی کے حسن سے گہرا لگاؤ ہے ایسا مزاج رکھنے والا اگر شاعر ہو تو عاشقی اس کے مزاج کا اہم جزو ہوتی ہے ان کی شاعری پڑھ کر ان کی زندگی کے پیچ وخم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ فن کار کا یہی تو کمال ہوتا ہے اگر اس کی زندگی سے لوگ واقف نہ بھی ہوں تو وہ جو فن پارے تخلیق کرتا ہے اس سے اس کے مزاج اس کی سرشت کا اندازہ کیا جاسکتا۔ ظاہر ہے کہ ہماری اردو شاعری میں بہت سے شاعر ایسے بھی ہوئے جن کا کلام ہم نے پڑھا ہے نہ ہم ان کے زمانے میں تھے نہ وہ ہمارے زمانے کے لوگ تھے لیکن قدرت نے ایسا شعور عطا کیا ہے کہ ہم ان کے فن پاروں سے یہ تاثر قائم کر لیتے ہیں کہ زندگی کے ساتھ ان کا رویہ کیا رہا ہوگا۔

ضروری نہیں کہ ہم ان کی ذاتی زندگی سے واقف ہوں اسی لئے کہا جاتا ہے کہ فن ہی فن کار کی سرشت اس کے مزاج کا آئینہ ہوتا ہے اس کی بہت سی مثالیں ہمارے یہاں موجود ہیں اور پھر عشق کرنا تو انسان کی فطرت ہے یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔ میرا بشیر بدر کا بہت کم ساتھ رہا ہے میں ان کی ذاتی زندگی پر براہ راست کوئی تبصرہ نہیں کر سکتا لیکن جو اشعار میں نے پیش کئے میں وہ ان کی زندگی کی تصویر کو نمایاں کرتے ہیں یعنی عاشقی ان کی سرشت میں ہے۔ اس کا اظہار ان کی شاعری سے ہوتا ہے۔ ان کی شاعری کا عرصہ نصف صدی سے بھی زیادہ ہے اور میں یہ دعویٰ تو کر ہی سکتا ہوں کہ میرا ان کا ساتھ نہ رہا ہو تو کیا ہوا، میں نے ان کی شاعری تو پڑھی ہے اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ عشق ان کے وجود کا ناقابل شکست حصہ ہے۔ یہ بات ان اشعار سے بھی ظاہر ہے اور ان اشعار سے بھی جو میں اب پیش کر رہا ہوں۔

مری زندگی کا عروج تھا تری نرم پلکوں کی چھاؤں میں
ترے ساتھ تھا مرا جاگنا تری آنکھ کیسے جھپک گئی

.....

میرے سینے پر قدم رکھے ہوئے سوتا رہا
جانے کیا تھی بات میں جاگا کیا روتا رہا
وادیوں میں گاہ اترا اور گہے پر بت چڑھا
ایک ہی تھا بوجھ جس کو عمر بھر ڈھوتا رہا

.....

یہ زعفرانی پُل اوراسی کا حصہ ہے
جو کوئی دوسرا بنے تو دوسرا ہی لگے

.....

پرانے قصبوں میں کتنا سکون ہوتا ہے
تھکے تھکائے ہمارے بزرگ سوتے ہیں
کسی کی یاد میں دہلیز پر دئے نہ رکھو
کواڑ سوکھی ہوئی لکڑیوں کے ہوتے ہیں

.....

خدا کا شکر کہ میرے جوان بیٹے کے
بدن سے آنے لگی زعفران کی خوشبو

.....

دہکتے نیزوں سے یہ رات حملہ کردے گی
سجا کے چاند کی کشتی میں میرا سردے گی
بہار اب کے لہو کے چڑھے سمندر کو
قلم کئے ہوئے بازو بریدہ سردے گی

.....

اب ملے ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے
انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ بشیر بدر کی شاعری میں بالخصوص غزل میں عاشقی کے حوالے سے عصری حسیت کیا ہے انہوں نے اپنی غزلوں میں اپنے پورے عہد کو سمیٹ لیا ہے۔

❑❑❑

ڈاکٹر بشیر بدر کی شاعری کا انفرادی زاویۂ نگاہ و جدید طرز اسلوب

رضیہ حامد

محقق ونقاد

ادبی صحافت میں سرگرم

فکر وآگہی، دہلی کی مدیرہ

مختلف انعامات واعزازات حاصل

۲۵ کتابوں کی مصنفہ

وطن بھوپال

شبستاں اپارٹمنٹ، سیکنڈ فلور

سید فتح علی اسٹریٹ

عیدگاہ ہلز، بھوپال

رابطہ: 7552544100

شعروادب اپنے عہد کا آئینہ ہوتے ہیں۔انسان کی زندگی میں درآئی تبدیلیوں کا اندازہ اس عہد کے شعروادب کے مطالعہ سے ہوجاتا ہے۔ بدلتے سماج کا ساتھ دینا شاعر وادیب کے لئے ناگزیر ہے۔ہر بڑے شاعر وادیب کا اپنا اسلوب ہوتا ہے جو اس کی انفرادیت کا مظہر ہوتا ہے۔اردو شاعری میں اپنے اسلوب کی وجہ سے میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ، جوشؔ، فیضؔ، اور فراقؔ کی آواز بالکل الگ پہچانی جاتی ہے۔

بیسویں صدی میں اردو غزل نے کئی تحریکات سے اثرات قبول کئے۔غزل میں نئے تجربے ہوئے اور کئی نام سامنے آئے، جیسے ظفر اقبالؔ، شہزاد احمدؔ، شمیم حنفیؔ، عادل منصوریؔ اور بشیر بدرؔ۔بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں بشیر بدرؔ کے اسلوب نے غزل کو نیا موڑ دیا۔انھوں نے غزل کے پرانے اسالیب میں ہمہ گیر بنیادی تجربوں سے غزل کی کائنات میں توسیع کی ہے۔

ڈاکٹر بشیر بدرؔ نے غزل کی مروّجہ زبان سے پہلوتہی کرتے ہوئے عام بول چال کی زبان کو شعر کے قالب میں ڈھالا ہے۔وہ لفظوں کے پارکھ ہیں۔انھوں نے انگریزی وہندی کے الفاظ کا برمحل تخلیقی استعمال کیا اور غزل کے شعر کو اپنے عہد کی زبان سے قریب کردیا ہے۔بشیر بدرؔ نے اردو غزل کی لفظیات میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔نئے الفاظ کے مزاج کو پہچاننا اور غزل کے شعری پیکر میں ڈھالنا بشیر بدرؔ کی شاعرانہ قوت اور فنکاری کی دلیل ہے:

گھر کتنے ہی چھوٹے ہوں گھنے پیڑ ملیں گے
شہروں سے الگ ہوتی ہے قصبات کی خوشبو

.....

یہاں لباس کی قیمت ہے آدمی کی نہیں
مجھے گلاس بڑا دے شراب کم کردے

.....

یہ خزاں کی زردسی شال میں جو اداس پیڑ کے پاس ہے
یہ تمھارے گھر کی بہار ہے اسے آنسوؤں سے ہرا کرو

بہت اچھا سا کوئی سوٹ پہنو تنگدستی میں
اُجالوں میں چھپی ان بدلیوں کو کون دیکھے گا

بشیر بدؔر نے اکثر اشعار میں گفتگو کا انداز اختیار کیا ہے اور جا بجا تم، تجھے، ترے، بدر جی، بدر صاحب، میاں اور بابا بھی تخاطب کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا باتیں کر رہے ہیں اس کے باوجود شعریت اور تاثیر میں فرق نہیں آتا۔ بحر اور وزن کی ضرورتوں کی وجہ سے نحوی ترتیب میں تقدیم و تاخیر ہوتی رہتی ہے لیکن جملہ کی ساخت برقرار رہتی ہے:

جب کبھی بھی تمہارا خیال آ گیا
پھر کئی روز تک بے خیالی رہی

....

ہم بھی دریا ہیں، ہمیں اپنا ہنر معلوم ہے
جس طرف بھی چل پڑینگے راستہ ہوجائے گا

....

پوچھا بہت جو ہم نے، کس اُور اب ملو گے
چٹکی میں ریت لیکراس نے اڑادیاہے

....

بدر صاحب کی غزل پھول کھلا دیتی ہے
دھوپ کے پرچوں میں اور آگ کے اخباروں میں

....

خوشی ہم غریبوں کی کیا ہے میاں
مزاروں پہ چادر چڑھائی ہوئی

....

سب لوگ یہ کہتے ہیں تم لوٹ گئے ہو
تم ساتھ تھے، تم ساتھ ہو، تم ساتھ رہو گے

....

تم ابھی شہر میں کیا نئے آئے ہو
رک گئے راہ میں حادثہ دیکھ کر

....

سر پر زمین لے کے ہواؤں کے ساتھ جا
آہستہ چلنے والے کی باری نہ آئے گی

بشیر بدؔر کے کلام میں جذبۂ احساس کی گھلاوٹ ہے۔ ان کے لہجہ میں دردمندی کے ساتھ دبی دبی تلخی بھی موجود ہے۔ بشیر بدؔر نے زندگی کے تجربات اور حادثات کو تشبیہ و استعارہ کے وسیلہ سے شعری پیکر میں ڈھالا ہے۔ انھوں نے سا، سے، جس، جیسے، جیسا، طرح اور مثل وغیرہ ادوات

تشبیہات کو بڑی خوبصورتی سے برتا ہے۔ ان کے کلام میں یہ تشبیہات معمولی ہوتے ہوئے بھی غیر معمولی بن جاتی ہیں اور غزل میں شعری لطف اور جمالیاتی حسن پیدا کرتی ہیں:

زینہ زینہ اترتا ہوا آئینہ
اس کا لہجہ انوکھا کھنک دار سا
کوئی پھول سا ہاتھ کاندھے پہ تھا
مرے پاؤں پھولوں پہ چلتے رہے

....

میں پیمبر تو نہیں لیکن مجھے احساس ہے
ان برے لوگوں میں بھی مجھ سے برا کوئی نہیں

....

یہ غزل کہ جیسے ہرن کی آنکھ میں ہو پچھلی رات کی چاندنی
نہ بجھے خرابے کی روشنی، کبھی بے چراغ یہ گھر نہ ہو

منتظر پھول میں خوشبو کی طرح ہوں کب سے
کوئی جھونکے کی طرح آئے اڑا کر لے جائے

بشیر بدؔر نے خوشبو، چاند، چاندنی، دھوپ، روشنی وغیرہ جیسے الفاظ کے ذریعہ مختلف نفسیاتی کیفیتوں کو دلکش انداز میں شعری پیکر عطا کئے ہیں:

موسم کی خوشبو میں اکثر غم کی خوشبو مل جاتی ہے
آموں کے باغوں میں کیسے ساون ساون برسا آنسو

....

پہلی بار نظروں نے چاند بولتے دیکھا
ہم جواب کیا دیتے کھو گئے سوالوں میں

....

ایکے آنسو آنکھوں سے دل میں اترے
رخ بدلا دریا نے کیسا بہنے کا

....

آسماں بھر گیا پرندوں سے
پیڑ کوئی ہرا گرا ہوگا

....

مہک رہی ہے زمیں چاندنی کے پھولوں سے
خدا کسی کی محبت پہ مسکرایا ہے

بشریر بدؔر کے کلام میں نئی نئی تراکیب اور حسی تلازمے ہیں جن سے شعریت میں اضافہ ہوتا ہے۔ جیسے شاخ کی باہیں، شبنمی آگ، پاندان کی خوشبو، چاند کی کشتی، خزاں کی دھوپ، آنسوؤں کی کھیتی، گیسوؤں کے پھول، تجربوں کی ردائیں، چاندنی کے شعلے، خوشبوؤں کا سایہ، صبح کے فرشتے، پہاڑوں کی صفیں، دھوپ کی پتیاں، کاغذی مقبرے، آنسوؤں کی زمیں، چاند کی پتیاں، دھوپ کے گجرے وغیرہ:

یہی انداز ہے میرا سمندر فتح کرنے کا
مری کاغذ کی کشتی میں کئی جگنو بھی ہوتے ہیں

....

ہاتھ پر دھوپ کی پتیاں رکھ گیا

کوئی پھولوں کی چادر بدلتا ہوا

بشیر بدرؔ کے کلام میں اکثر طویل بحروں میں چھوٹے چھوٹے نحوی واحدے ہیں جن کی وجہ سے جذبات کی فوری ترسیل اور تاثیر میں مدد ملتی ہے۔

مری زندگی بھی مری نہیں یہ ہزار خانوں میں بٹ گئی
مجھے ایک مٹھی زمین دے یہ زمین کتنی سمٹ گئی

.....

میں سنہرے پتوں کا پیڑ ہوں میں خزاں کا حسن ووقار ہوں
مرے بال چاندی کے ہوگئے مرے سر پہ دھوپ ٹھہر گئی

.....

یونہی بے سبب نہ پھرا کرو کوئی شام گھر بھی رہا کرو
وہ غزل کی سچی کتاب ہے اسے چپکے چپکے پڑھا کرو

ڈاکٹر بشیر بدرؔ زمین کی گہرائیوں میں پیوست پر اکرتوں کی جڑوں سے اپنی شعری زبان کو سنوارتے اور طاقت حاصل کرتے ہیں۔

ان کے کلام میں عربی و فارسی کی صفیری آوازوں کے ساتھ دیسی ہکاری اور معکوسی آوازیں گھلی ملی ہوئی ہیں۔

بھ، پھ، جھ، دھ، تھ، کا استعمال ان کے زمین سے جڑے ہونے کی علامات ہیں۔ بشیر بدرؔ کی شاعری میں ماٹی، سانجھ، مٹی، سویرے، دہلیز، دیئے، انگنائی جیسے الفاظ' برج بھاشا کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

چھپر کے چائے خانے بھی اب اونگھنے لگے
پیدل چلو کہ کوئی سواری نہ آئے گی

.....

مدّت کے بعد دھوپ کی کھیتی ہری ہوئی
اب کے برس برس گئی بادل کی اوڑھنی

.....

انگنائی میں کھڑے ہوئے بیری کے پیڑ سے
وہ لوگ چلتے وقت گلے مل کے روئے تھے

بہت سے اور بھی گھر ہیں خدا کی بستی میں
فقیر کب سے کھڑا ہے جواب دے جاؤ

.....

چھپروں پر دیئے رکھ گئی ہے ہوا
تاکہ پھر روشنی کی ضرورت نہ ہو
تمام عمر مرا دم اسی دھوئیں میں گھٹا
وہ اک چراغ تھا میں نے اسے بجھایا ہے

.....

کسی کی راہ میں دہلیز پر دیئے نہ رکھو
کواڑ سوکھی ہوئی لکڑیوں کے ہوتے ہیں

بشیر بدرؔ کے کلام میں طویل مصوّتوں کے استعمال سے زبان میں لوچ اور نغمگی پیدا ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ نون غنّہ کے استعمال سے بھی ترنم پیدا ہوا ہے، جیسے اللہ تیرو نام، صندل کردو، جگنو آئے، کررہے ہیں، ہوجائے گا، ہوا نہ ہو، جائیں گے، لگتا ہے، خوشبو آئے، بابا، ہوتے ہیں، بھیگا کریں، مہکتی ہیں، جاؤں گا، ہرا کرو، برات میں، آسماں ہے، آتے ہیں، وغیرہ۔

بشیر بدرؔ کے کلام میں اکثر بحریں مترنّم ہیں۔ ان کے یہاں طویل بحروں کے زیر و بم میں ہلچل پیدا کرنے والا لطیف احساس نغمگی کے ساتھ قاری کی روح کو سرشار کرتا ہے۔

بشیر بدرؔ کے کلام میں قافیوں کی تکرار اور ان کی طوالت میں بھی جذبہ وٴ احساس کے جلترنگ سنائی دیتے ہیں:

کوئی فرق شاہ و گدا نہیں، کہ یہاں کسی کو بقا نہیں
یہ اجاڑ محلوں کی سن صدا، جو گزر گیا سو گزر گیا

.....

ذرا دیکھ چاند کی پتیوں نے بکھر بکھر کے تمام شب
ترا نام لکھا ہے ریت پر کوئی لہر آ کے مٹا نہ دے

.....

مری داستاں کا عروج تھا تری نرم پلکوں کی چھاؤں میں
مرے ساتھ تھا تجھے جاگنا تری آنکھ کیسے جھپک گئی

بشیر بدرؔ کے فکر و احساس، زبان و بیان کی تخلیقی قوّت اور اختراعی صلاحیت نے غزل کو نیا رنگ و آہنگ اور اسلوب دیا ہے۔

ان کا کلام خاص و عام میں مقبول ہے۔ بشیر بدرؔ کے کئی اشعار اور مصرعے ضرب المثل بن گئے ہیں:

شہرت کی بلندی بھی پل بھر کا تماشہ ہے
جس ڈال پہ بیٹھے ہو وہ ٹوٹ بھی سکتی ہے

.....

دل کی بستی پرانی دلّی ہے
جو بھی گزرا ہے اس نے لوٹا ہے

.....

دشمنی کا سفر اک قدم دو قدم
تم بھی تھک جاؤ گے ہم بھی تھک جائیں گے

.....

اُجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہوجائے

.....

مجھ سے کیا بات لکھانی ہے کہ اب میرے لئے
کبھی سونے کبھی چاندی کے قلم آتے ہیں

.....

تتلی کے نازک پنکھوں پر آنسو کی تحریر غزل ہے
لفظوں کی مینا کاری کو الہامی اشعار نہ جانو

.....

خوابیدہ گلابوں پر یہ اوس بچھی کیسے
احساس چمکتا ہے اسلوب کی خوشبو میں

بشیر بدرؔ کے اسلوب نے نصف صدی کو متاثر کیا ہے۔ بلا شبہ آج کی غزل کا محبوب اسلوب بشیر بدرؔ کا اسلوب ہے۔ اس کی خوشبو ہمہ گیر پیمانہ پر غزل کو معطر کررہی ہے۔

❑❑❑

بشیر بدر علو ہمت و گہر افشاں
بشیر بدر کی ولادت کا مصرعۂ تاریخ

ضیاء فاروقی
ادیب وشاعر
پانچ کتابوں کے مصنف
مختلف موضوعات پر
تنقیدی مضامین کی اشاعت
کئی رسائل وجرائد کی ادارت
کئی انعامات واعزازات حاصل
وطن ہردوئی
10-H-K, MHKITC
رفیقیہ اسکول روڈ، بھوپال
رابطہ: 9406541986

یادش بخیر ہم لوگوں کو ساتویں دہائی میں جن شاعروں کا کلام متاثر کرتا تھا اُن میں بشیر بدر کا نام یقینا اہم ہے۔ اُس زمانے میں جہاں اختر شیرانی، ساحرؔ لدھیانوی اور فیض احمد فیضؔ جیسے شعراء کی رومانی نظمیں ہم طالب علموں کی محفلوں کی زینت بنتی تھیں وہیں بشیر بدر کے اِس طرح کے اشعار بھی نوکِ زبان پر رقص کرتے تھے۔

آنکھیں آنسو بھری پلکیں بوجھل گھنی جیسے جھیلیں بھی ہوں نرم سائے بھی ہوں
وہ تو کہئے اُنھیں کچھ ہنسی آگئی بچ گئے آج ہم ڈوبتے ڈوبتے

....

بے وقت اگر جاؤں گا سب چونک پڑیں گے
اِک عمر ہوئی دن میں کبھی گھر نہیں دیکھا

دراصل ملک کی آزادی کے بعد جہاں دوسرے شعبہ ہائے حیات متاثر ہوئے وہیں اُردو شعر وادب میں بھی تغیر وتبدل کی فضا قائم ہوئی۔ خصوصاً اُردو غزل جس نئے رنگ اور آہنگ کے ساتھ اُبھر کر سامنے آئی اُس نے جدیدیت کے زیرِ سایہ شاعروں کے ایک بڑے طبقے کو متاثر کیا۔ اِس طبقہ میں وہ نسل بھی تھی جس کے سامنے غزل کی کلاسیکی اقدار بھی تھیں اور جدید علامتوں اور استعاروں کا ایک وسیع اور شاداب منظر بھی۔ ناصر کاظمی، منچندا بانی، زیب غوری، شہریار، عرفان صدیقی، ظفر اقبال اور بشیر بدر وغیرہ اِسی ماحول کے پروردہ شاعر ہیں۔ بشیر بدر اِن معنوں میں خوش قسمت ہیں کہ اُنھیں شروع سے ہی اہم شخصیات کا ساتھ ملا اور اُس عہد کے تمام بڑے رسائل میں اپنا کلام شائع کرانے کے مواقع ملے۔ یہی وجہ ہے کہ نوجوانی میں ہی اُن کی شاعرانہ حیثیت اِتنی مستحکم ہوچکی تھی کہ شعر وادب کی مقتدر شخصیات کے درمیان اُن کے اشعار موضوعِ گفتگو رہتے تھے۔ اُن کی غزل علی گڑھ یونیورسٹی کے ایم۔اے کے نصاب میں اُس وقت بھی داخل تھی جب وہ خود علی گڑھ گریجویشن کرنے پہنچے۔ یہاں یہ تذکرہ غالباً غیر ضروری نہ ہوگا کہ خان بہادر سیّد مسعود حسن ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر وتعلقہ دار لکھیم پور کھیری نے تاریخی قطعات پر مشتمل اپنی کتاب ''عندلیب التواریخ'' ۱۹۶۳ء میں ترتیب دی تو ملک کی دوسری اہم شخصیات کے قطعۂ پیدائش یا وفات کے ساتھ ساتھ بشیر بدر کا قطعۂ تاریخ

پیدائش بھی کتاب کے صفحہ نمبر ۹۱ پر درج کیا۔ اِس قطعہ سے جہاں بشیر بدر کی اُس وقت کی شہرت کا اندازہ ہوتا ہے وہیں سن پیدائش بھی پتہ چلتا ہے۔

ولادت جناب بشیر بدر فیض آبادی:

مذاقِ خاص میں ہوتا ہے شعر کا عنواں
ہیں ایک شاعر طرز آفریں و شستہ بیاں
یہ اُن کا سالِ ولادت ہے عیسوی مسعود
بشیرِ بدر علو ہمت و گہر افشاں
۱۹۳۲ء

لطف کی بات یہ ہے کہ مسعود حسن صاحب نے بشیر بدر کے نام کے ساتھ فیض آبادی بھی لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ اُس وقت بشیر صاحب اپنی فیض آبادی نسبت کا استعمال تخلص میں کرتے ہوں۔ بہرکیف!

بشیر بدر کا پہلا مجموعہ ''اکائی'' ۱۹۶۹ء میں منظرِ عام پر آیا۔ پھر بیس سال کے اندر اندر دو اور مجموعے ''امیج'' اور ''آمد'' کے نام سے منظرِ عام پر آئے۔ اِن مجموعوں کا شعری اثاثہ اِتنا وقیع تھا کہ اُس نے شائقینِ ادب کے ایک بڑے حلقے کو بشیر بدر کا گرویدہ بنا دیا اور خواص کے ساتھ ساتھ اُن کی عوامی مقبولیت بامِ عروج پر پہنچ گئی۔ اُن کا پڑھنے کا انداز اور تغزل سے بھرپور عوامی لہجہ مشاعروں میں اُن کی شناخت بنتا چلا گیا۔

یہ ایک کلیہ ہو یا نہ ہو لیکن ہوتا یہ ہے کہ عام طور پر ہر شاعر کو اُس کی زندگی کے پندرہ بیس سال ایسے ضرور ملتے ہیں جب وہ اپنی تخلیقی توانائیوں کا بھرپور استعمال کرتا ہے اور پھر اُسی سرمائے کو سینے سے لگا کر اپنی باقی ماندہ زندگی گزار دیتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ بشیر بدر کے ساتھ بھی کم وبیش یہی صورتِ حال رہی۔ اُنھیں علی گڑھ میں آل احمد سرورؔ اور خلیل الرحمن اعظمی جیسے لوگوں کی سرپرستی حاصل ہوئی جہاں اُنھوں نے اپنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا۔ پھر میرٹھ میں قیام کے دوران ملک اور بیرونِ ملک کے مشاعروں نے اُنھیں بے حد فعال رکھا مگر دیکھا جائے تو میرٹھ کے قیام کے دوران وہ جہاں پذیرائی سے تشہیر کی بلندیوں تک گئے وہیں ذہنی شکست و ریخت سے بھی دوچار ہوئے۔

پہلی بیوی کا انتقال، فسادات میں گھر کی بربادی کا احساس، ایسا تھا کہ وہ شاعر جو علی گڑھ کے قیام کے دوران اپنے افکار سے جدید شعری منظرنامے کو نیا رنگ و روغن عطا کر رہا تھا وہ ذہنی انتشار کا شکار ہو گیا۔

حالانکہ بعد میں وہ اِس صدمے سے اُبھر آئے لیکن فکری طور پر تبدیلی کی ایک تہہ نشین لہر کا بھی احساس ہوتا ہے جو مطالعہ کا متقاضی ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ اِن حادثوں کے بعد اُنھوں نے اشعار نہیں کہے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اُن کی شناخت کے ضامن زیادہ تر وہی مقبول عام اشعار ہیں جو اِن حادثات و واقعات سے پہلے کے ہیں۔

بشیر بدر کے مطالعہ میں ان کی مشاعروں میں مقبولیت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک طرف ان کے مشاعروں میں ہزاروں سامعین کی موجودگی، ان کی حاضر جوابی اور اشعار ایسے کہ جو دل سے نکلیں اور سامع کے دل میں تیر کی طرح جا گزیں ہو جائیں۔ انھوں نے مشاعروں کی اہمیت و حیثیت کو آسمان بنا دیا تھا۔

دوسری طرف مشاعروں میں شرکت وشمولیت اور یافت نے ان کو وہ طرزِ ادا عطا کی جو آج ان کی شہرت کا سبب ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ روزمرہ کے سامنے کے الفاظ کا شعر میں استعمال کا تخلیقی ہنر جس طرح بشیر بدر کو آتا ہے وہ پوری اردو شاعری میں بہت کم دیکھنے کو ملتا ہے۔

آرزو لکھنوی کی غزلیں ہوں یا انشاء اللہ خاں انشاؔ کی رانی کیتکی کی کہانی دونوں نے ایسی اردو کا استعمال کیا جس میں عربی فارسی کے الفاظ نہ ہوں، جان بوجھ کر اور باقاعدہ منصوبے کے ساتھ کیا گیا یہ تجربہ نقلی لگتا ہے اس میں وہ روح وہ زندگی نہیں ہے جو بشیر بدر کی غزلوں میں ہے۔

ایک دریا ایک بہتا پانی اور قدرتی روانی کا احساس۔ چنانچہ جب وہ اپنے سرمدی ترنم سے غزل شروع کرتے تھے تو سامعین کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اس طرح سے تموج پر آجاتا تھا جیسے ماہ کامل آنے پر سمندر میں مدوجزر آجاتا ہے۔

بشیر بدر کی دوسری شادی ۱۹۸۸ء میں بھوپال کے ایک معزز خاندان میں سیّد فتح علی جو نواب بھوپال کے سکریٹری تھے، اُن کی صاحبزادی راحت کے ساتھ ہوئی اور اِس طرح وہ ۱۹۹۴ء میں مستقل قیام کی غرض سے بھوپال آ گئے اور تا ایں دم یہیں قیام پذیر ہیں۔

بشیر بدر نے جیسا کہ اپنے ایک شعر میں اظہار بھی کیا ہے، اُن کی نگاہ ہمیشہ منزل پر رہی اور اِس کے لیے ہر وہ قدم اُٹھایا جو اُن کو منزل تک پہنچانے میں معاون ہو، اُنھوں نے خود اپنے کلام کو تنقیدی نکتۂ نگاہ سے بھی دیکھا اور اُس کو زیادہ پائیدار بنانے کے امکانات پر بھی غور کرتے رہے۔

میں یہاں اُن کے شعری رویوں پر کوئی گفتگو نہیں کروں گا کہ اِس سلسلے میں مشاہیرِ ادب بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور لکھا جا تا رہے گا۔ میں تو آج جب بشیر صاحب کو دیکھتا ہوں تو خود اُن کا یہ شعر ذہن کے کسی گوشے میں دَر آتا ہے۔

منزل پہ حیات آ کے ذرا تھم سی گئی ہے
معلوم یہ ہوتا ہے بہت تیز چلی ہے

❑❑❑

بشیر بدر کی تخلیقیت اور سکونت

کا حسین امتزاج: بھوپال

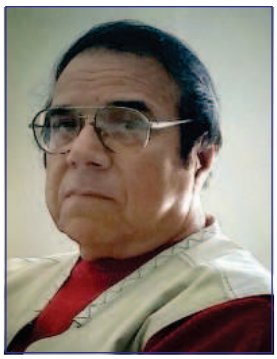

اقبال مسعود

جدید شاعری کے نقاد

چار کتابوں کے مصنف

کئی ادبی رسائل کی ادارت

مدھیہ پردیش اردو اکادمی میں

جوائنٹ سکریٹری کے عہدے پر فائز

وطن بھوپال

A-23/4، رجٹ اپارٹمنٹ، بی ڈی اے کالونی، کوہ فضا، بھوپال

رابطہ: 9827089881

بھوپال کو شہر اقبال بھی کہا جاتا ہے۔ بشیر بدر جب بھوپال آئے تو ان کے سر پر شہرتوں اور مقبولیت کا تاج زریں جگمگا رہا تھا۔ وہ اردو دنیا کے محبوب شاعر بن چکے تھے اس وقت تک ان کے تین دیوان۔ اکائی، امیج اور آمد آچکے تھے ساتھ ہی ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کیا تھا جس کے سبب ان کی نثر نگاری اس میں استعمال تخلیقی جملوں اور تحقیق کو بھی اعتبار کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا۔

اسی اثنا میں جب وہ پاکستان کے ادبی دورے پر تھے ان کی شریک حیات قمر جہاں شہناز جو عسرت، ناکامی اور تنہائیوں کی رفیق تھیں بچھڑ گئیں دریں اثنا میرٹھ کے فسادات میں ان کی زندگی بھر کا اثاثہ جو تنکے تنکے جوڑ کر بنایا تھا لوٹا گیا، یہ دو صدمے بشیر بدر جیسے حساس شاعر کے لئے صدمہ جانکاہ ثابت ہوئے انھوں نے ایک جگہ تحریر کیا ہے۔

''میری شریک حیات.... جن کی رفاقت کا اجالا زندگی کے بڑے سے بڑے اندھیروں سے معرکہ آرائی میں میرا حوصلہ ثابت ہوا جن کی پلکوں پر میرے آنسوں رقص کرتے تھے.... اور جن کی دوستی میری غزل کا نور تھی''۔

ان سے اچانک جدا ہو گئیں اور ایک ہنستی کھیلتی زندگی افسانہ بن گئی۔ بشیر بدر کے لئے یکے بعد دیگرے صدمات نے ان کو ڈپریشن میں مبتلا کر دیا، عجب سی بے حسی، اداسی دل پر مسلط ہو گئی ان کے والد پر بھی جب غبن کا الزام لگایا گیا تھا تو وہ بھی ڈپریشن کا شکار ہو گئے تھے اور اسی طرح کہ سب کچھ فراموش کر بیٹھے تھے۔

کہتے ہیں میر تقی میر بھی اسی طرح کی صورت حال سے گزر رہے تھے۔ بشیر بدر کی خوش قسمتی ہے کہ ان کی ایک دوست نے بھوپال کے ایک عالی مرتبت خاندان میں ان کا رشتہ کروا دیا۔

ان کی دوسری بیگم سیدہ راحت بدر بیحد تعلیم یافتہ خاتون ہیں انھوں نے جس طرح ان کی خدمت کی ان کی تیمار داری کی ان کا خیال رکھا۔ بشیر بدر نے ان کے لئے جو شعر کہا وہ اس کا اعتراف ہے۔

تم نے دیکھا ہے کسی میرؔ کو مندر میں کبھی
ایک دن اس نے خدا سے اس طرح مانگا مجھے

بھوپال آنے کے بعد بشیر بدرؔ کے دو اور دیوان 'آسمان' اور 'آہٹ' شائع ہوئے اس کے علاوہ ان کی کلیات بھی زیور طبع سے آراستہ ہوکر ہندو پاک میں سر پر اٹھائی گئی اور آنکھوں سے لگائی گئی۔

اس شہرِ بے مثال میں بود و باش اختیار کرنے کے بعد ان کو پدم شری کا اعزاز ملا ساہتیہ اکادمی کے ایواڈ سے نوازے گئے اور پھر گویا اعزاز و اکرام ان کے سامنے صف باندھے کھڑے ہوگئے، بڑے بڑے سینئر IAS افسران اور IPS حکام ان کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے چیرمین تفویض کیے گئے، کئی اہم جامعات کی مجلس عاملہ کے رکن نامزد ہوئے۔

وہ میرٹھ سے صرف اپنی چاکلیٹی رنگ کی ماروتی 800 لے کر آئے تھے اس گاڑی سے ان کو ذہنی ربط تھا یہ ان کی پہلی تنخواہ سے خریدی گئی تھی۔ یہ گاڑی اب بھی ان کے پاس ہے اب جبکہ وہ کئی شاندار گاڑیوں کے مالک ہیں ایک خوبصورت حویلی نما گھر ہے سب کچھ ہے بس ڈپریشن کے دورے اور شدید دورے نے دماغ کی پلیٹ صاف کردی ہے۔ صحت مند ہیں لیکن نام بھی یاد نہیں نہ شعر یاد ہے نہ اپنی شخصیت کا احساس و ادراک ہے اور ایک بار پھر ان کی نصف بہتر ڈاکٹر راحت بدر میرؔ بن کر اپنے کرشن کی خدمت میں مصروف ہیں اور ایک بار پھر بشیر بدر خاموش ہیں ایک ساز تیز جھنکار کے بعد ٹوٹ گیا ہے اور وہ سمفنی جو نہ جانے کتنے نئے راگ تخلیق کرتی اب کتابوں کے ہاوس آف ویکس میں خاموش کھڑی ہے۔

بشیر بدر جب بھوپال آئے تھے تو ان کے مریضوں نے یہ مشتہر کر رکھا تھا کہ وہ اب اپنے آپ کو دوہرا رہے رہیں ان کا تخلیقی چشمہ خشک ہو چکا ہے ان کے یہاں تھکن کے آثار پیدا ہوگئے ہیں۔ حالانکہ پانچ مجموعہ شائع ہونے کے باوجود وہ جب تک ہوش میں رہے ان کا تخیل ان کا اسلوب اور امیجری کی شگفتگی نیا پن خوبصورتی اور شادابی برقرار رہی چند اشعار ملاحظہ کریں۔ یہ ''آسمان'' اور ''آہٹ'' سے منتخب کئے گئے ہیں۔

کیوں مجھ سے لرزتے ہیں دو عالم کے اندھیرے
میں چاند، نہ سورج، نہ ستارہ نہ دیا ہوں

.....

کوئی میرؔ ہو کہ بشیرؔ ہو، جو تمہارے ناز اٹھائیں ہم
یہ ظفرؔ کی دلی ہے، باادب یہاں ہر کسی کا گزر نہیں
جب اسکی نوازش ہوتی ہے یہ معجزہ تب ہوجاتا ہے

الفاظ بہکنے لگتے ہیں، کاغذ بھی ادب ہوجاتا ہے
دل شکستہ کوئی ہم جیسا یہاں فن ہے کیا
دیر تک رات کو رونے کی صدا آتی ہے

.....

آنکھیں آنسو، دل بھی آنسو، شاید ہم سرتا پا آنسو
تھوڑی مٹی اور ملا دے ابھی بہت گیلی ہے مٹی

.....

اس نے چھوکر مجھے پتھر سے پھر انسان کیا
مدتوں بعد مری آنکھ میں آنسو آئے
کبھی بولو تو شہروں کے مکاں بھی بات کرتے ہیں
تمھارے ذہن میں تو صرف قصبے کی حویلی ہے

آپ نے غور کیا کہ بشیر بدر کی غزلیات میں فارسی آمیز لفظیات تراکیب سے گریز ہے اور اگرچہ وہ پہلے بھی فارسی آمیز لفظیات تراکیب استعارے اور تمثیل کا زیادہ استعمال نہیں کرتے لیکن بھوپال آمد کے بعد یہ رویہ ان کی شاعری میں ایک تحریک کا طرح نمایاں ہوا۔

انھوں نے اپنی پرانی غزلوں کی الٹ پلٹ کر ایسے الفاظ نکال دئے اور ان کی جگہ سادہ لفظیات لکھ دیں ''آہٹ'' اور ''آسمان'' میں ایسی کئی غزلیں شامل ہیں اس سلسلہ میں ان کی ایک طویل غزل کے چند اشعار قابل توجہ ہیں اور ان کو سمجھنے میں معاون ہے

آزاد کردے اپنا گرفتار میں ہی ہوں
سر پر لٹک رہی ہے جو تلوار میں ہی ہوں

اس بیسویں صدی میں تھے فیضؔ و فراقؔ بھی
اکیسویں صدی کا اداکار میں ہی ہوں

اپنے سوا کسی سے محبت نہیں مجھے
غالبؔ بہت شریف تھے مکار میں ہی ہوں

کیا واسطہ غزل کو پرانے عروض سے
اندھے مجھے ٹٹول کہ فنکار میں ہی ہوں

اب سو کروڑ لوگ سنبھالیں گے راج پاٹ
اردو غزل کا آخری دربار میں ہی ہوں

میں لڑتے لڑتے ٹوٹ گیا اپنے آپ سے
راون کا روپ رام کا اوتار میں ہی ہوں

مذکورہ بالا اشعار میں شاعرانہ تعلّی بھی ہے، سادگی بھی ہے، معنی خیزی بھی ہے اور غضب یہ کہ قدیم روایات کی پاسداری کے باوجود انھوں نے اپنی غزل کو منفرد بنا دیا ہے انھوں نے اگر یہ دعوی کیا کہ آنے والے زمانوں کا شاعر وہ ہیں اور وہی زندہ

رہے گا جس کا اسلوب لفظیات بشیر بدر کی طرح ہوں گے ان کی طرح ادب میں رنگ خوشبو اور تازگی کا اضافہ کر سکے گا دیکھئے اکیسویں صدی کے بارے میں وہ کیا کہتے ہیں۔

کمپیوٹر وں سے غزلیں لکھیں گے بشیرؔ بدر
غالب کو بھول جائے گی اکیسویں صدی
آہن میں ڈھلتی جائے گی اکیسویں صدی
پھر بھی غزل سنائے گی اکیسویں صدی

بشیر بدر کی شاعری اکیسویں صدی تک آتے آتے بہت تبدیل ہوگئی۔ جب غزل یارانِ سخن کے لادے ہوئے جھوٹے علامتی زیوروں کے بوجھ سے دبی سہمی سی حالات کے دوراہے پر حیران و پریشان کھڑی، قید وقفس، برق ونشیمن، گل وصیاد، ساغر وسبو، طول شب ہجراں، صبح کی سرخی نیا سویرا وغیرہ یہ وہ طوق وسلاسل تھے جو غزل کی کائنات سمجھ لئے گئے۔

بشیر بدر نے اس ڈکشن سے انحراف کیا، ان کی غزلوں میں خوبصورتی ماضی کی، حال کی اُداسی اور مستقبل کا خوف ہے،۔ بشیر بدر کی غزل آنسوؤں سے دُھلی معصوم پاکیزہ غزل ہے۔

بہت سے ناقد حضرات کہتے ہیں کہ بشیر بدر کی تخلیقی کائنات کا کوئی لائحہ عمل یا اس میں فکر نہیں ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا غالبؔ کے یہاں کسی فکر یا نظریہ کے نشان ہیں اور اگر ہیں تو بشیر بدر کے یہاں بھی ہیں ان کی فکر کا محور درحقیقت تصوف ہے۔ رنگ نسل و زبان سے اوپر انسان و انسانیت ہے اور ہر فرد و بشر سے محبت بشیر بدر کا خاندانی سلسلہ تصوف سے وابستہ ہے۔ وہ خود اور ان کے والدین باقاعدہ ایک بزرگ کے ہاتھ پر بیعت ہیں۔ ویسے بھی تصوف جدیدیت کے باوجود مشرق کی فکر کا بنیادی پتھر ہے۔ دیکھئے قلی قطب شاہ کی ایک غزل کی زمین کے رنگ وآہنگ سے لطف لیتے ہوئے اپنی آواز ولہجہ کی مشعل فروزاں کرتے ہوئے جو غزل تخلیق کی ہے وہ ان کے فکر وفن کی عکاس بھی ہے اور بھوپال میں کہی گئی غزلیات کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔

لگی دل کی ہم سے کہی جائے نا
غزل آنسوؤں سے لکھی جائے نا
خدا سے یہ بابا دعائیں کروں
ہمیں چھوڑ کر وہ کبھی جائے نا

نہ مندر نہ مسجد نہ دیر و حرم
ہماری کہیں بھی سنی جائے نا

سناتے سناتے سحر ہوگئی
مگر بات دل کی کہی جائے نا

سویرے سے پن گھٹ پہ بیٹھی رہوں
پیا بن گگریا بھری جائے نا

عجب ہے کہانی مرے پیار کی
لکھی جائے لیکن پڑھی جائے نا

بھوپال میں آکر بشیر بدر کی اقبال مندی میں مزید اضافہ ہوا۔ قومی ذرائع ابلاغ کے لیے ان کا نام ہی کافی تھا۔ دوردرشن اور آکاشوانی کے لیے ان کا طویل لائف انٹرویو آرکائیز ڈاکٹر انجم بارہ بنکوی نے ریکارڈ کیا۔ انجم بارہ بنکی نے مولانا برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال سے ان پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اس دوران بشیر بدر کی انا بہت بڑھ گئی اور انھوں نے تعلّی کی حد کردی، دوسری طرف ان کی غزلوں میں سادگی وطرحداری، انفرادیت کے نقوش اور زیادہ گہرے ہوئے۔

ہندی سے قربت بڑھی اور انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ہندی اور اردو کے درمیان دوستی و محبت کا ایسا پل تعمیر کیا کہ جس نے غزل کو ایک طرف تو ہندوستانی بنا دیا اور دوسری طرف پتلی گلی سے نکل کر غزل اس شاہراہ پر رواں دواں ہوگئی جو ملک کے قومی دھارے سے وابستہ تھی اور دوسری طرف ہمہ جہتی تہذیب کا عکس بن گئی۔ بشیر بدر کا یہ تنہا کارنامہ ہی ایسا ہے جو ان کو ہمیشگی عطا کرے گا اور بقائے دوام کے دربار میں خلعت فاخرہ سے نوازا جائے گا۔

❑❑❑

اودھ نمبر کتابی شکل میں

'نیادور' نے گزشتہ برسوں میں کئی اہم اور دستاویزی نمبر شائع کئے ہیں۔ انہیں میں سے ایک 'اودھ نمبر' بھی ہے جسے دوحصوں شائع کیا گیا تھا۔ اب اسے ایک کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اردو ادب و تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جو قارئین کرام اسے خریدنا چاہتے ہیں، وہ نیادور سے براہ راست یا بذریعۂ ای میل رابطہ قائم کرسکتے ہیں۔ اس کی قیمت ۲۰۰؍روپئے ایڈوانس دینی ہوگی اور اسے منگوانے کیلئے ڈاک یا کوریر پر آنے والا خرچ ۵۰؍روپئے ملا کر کل قیمت ۲۵۰؍روپئے خریدار کے ذمہ واجب الادا ہوگی۔

ایڈیٹر ماہنامہ 'نیادور'

بشیر بدر کی شاعری کا نشیب و فراز اکائی سے آمد تک

احمد محفوظ

مشاہیر شعراء کے دیوان کی تدوین کے ماہر، دہلی اردو اکادمی کے انعام سمیت مختلف اعزازات حاصل، 'کلام میر کی تنقید پر تنقید' پر جے.این.یو. سے ڈاکٹریٹ، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو، میں پروفیسر، بنیادی طور پر شاعر، وطن الہ آباد

B-14، مجیب باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی

رابطہ: 9818952518

اس میں کوئی شک نہیں کہ گذشتہ چار پانچ دہائی کے دوران اردو مشاعرے کی دنیا میں جو چند غزل گو شعرا اپنی تابانی کے ساتھ چھائے رہے، ان میں بشیر بدر (پیدائش ۱۹۳۵) کا نام بہت نمایاں ہے۔

بشیر بدر کا تعلق جدید شعرا کی اس نسل سے ہے، جو اگرچہ ترقی پسند تحریک کے زمانے میں سامنے آئی، لیکن جس کی تخلیقی سرگرمیاں اس تحریک کے آخری دنوں میں نمایاں ہونا شروع ہوئیں۔ اس نسل میں ایک طرف وہ شعرا تھے جنھوں نے ترقی پسند حلقے سے الگ اپنی شناخت قائم کی، اور جدید غزل کے نمائندہ شعرا میں شمار ہوئے، لیکن انھوں نے مشاعرے کی دنیا سے عام طور پر خود کو الگ رکھا۔ دوسری طرف وہ شعرا تھے جن کی نمایاں پہچان مشاعرے کے حوالے سے قائم ہوئی۔ بشیر بدر کا تعلق شعرا کے اسی حلقے سے رہا ہے۔ البتہ ایک بات جو انھیں مشاعرے کے دیگر مقبول عام معاصر شعرا سے الگ کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے کلام کے کئی مجموعے نہ صرف اشاعت پذیر ہوئے، بلکہ ان پر سنجیدہ ادبی حلقے میں ایک حد تک بحث و گفتگو بھی ہوئی۔

'ایک حد تک بحث و گفتگو' سے میری مراد یہ ہے کہ ایک زمانے میں بشیر بدر کے کلام کو زیر بحث ضرور لایا گیا، لیکن وہ سلسلہ بہت دور تک نہیں چلا۔ اس کا ایک سبب شاید یہ رہا ہے کہ شروع شروع میں بشیر بدر نے اپنی غزلوں میں جو انداز اختیار کیا وہ بڑی حد تک نیا اور تازہ تھا۔ اس لیے لوگ اس کی طرف خاص طور سے متوجہ ہوئے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس لہجے میں چونکہ رومانیت کی لے بھی شامل تھی، اور جا بجا اس کی تیزی بھی نمایاں ہوتی رہی، اس لیے اس کا سحر بہت دیر تک لوگوں کو اپنی گرفت میں نہیں لے سکا۔ یہاں ''اکائی'' مطبوعہ ۱۹۶۹ سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

اک سمندر کے پیاسے کنارے تھے ہم اپنا پیغام لاتی تھی موج رواں
آج دو ریل کی پٹریوں کی طرح ساتھ چلنا ہے اور بولنا تک نہیں

.....

آج کی رات اتنی اندھیری ہے کیوں آج کی رات اتنی اکیلی ہے کیوں
جو سر شام ہم کو جگا آئے تھے ایک آواز دے کر کہاں سو گئے

نہیں ہے میرے مقدر میں روشنی نہ سہی
یہ کھڑکی کھولو ذرا صبح کی ہوا ہی لگے

.....

شاید مرے آنسو سے اس کا کوئی رشتہ ہے
تپتے ہوئے صحرا میں جو پھول اکیلا ہے

.....

دروازے شہر درد کے کھلنے دو دوستو
نکلے گا مسکراتا ہوا شام غم کا چاند

ان اشعار سے صاف محسوس کیا جا سکتا ہے کہ یہاں عشقیہ مضامین کو جس نہج سے بیان کیا گیا ہے، اس میں جذبات کی اوپری سطح بہت نمایاں ہے۔ خیال رہے کہ ایسے اشعار جو عشق کے سطحی جذبات کے حامل ہوتے ہیں اگر انھیں کسی قدر سلیقے سے بیان کیا جائے یا ان میں سلاست اور سادگی رکھی جائے تو عوام میں ان کی غیر معمولی پذیرائی کا امکان رہتا ہے۔ اور اگر ایسا کلام مشاعرے میں پڑھا جائے تو وہ عام طور سے شاعر کی مقبولیت کا ضامن ہوتا ہے۔ ایسے اشعار نیم پختہ ذوق کے حامل افراد کو بہت جلد متاثر کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ مشاعرے کی دنیا میں ایسے کلام کی پست ترین سطح وہ ہوتی ہے جن میں سماجی اور سیاسی موضوعات کو بھونڈے انداز میں اور بہت کھول کر بیان کیا جاتا ہے۔ ان اشعار کے ذریعہ شعرا سامعین کا جذباتی استحصال کرتے ہیں، اور مشاعرے کے بھولے بھالے شائقین ان کے جال میں پھنس جاتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں بھی ایسے شعرا کو جا بجا دیکھا جا سکتا ہے، جن کی مقبولیت کا گراف مشاعروں کی دنیا میں بہت بلند ہے، لیکن شعر و ادب کے سنجیدہ حلقوں میں ان کی وقعت معدوم ہے۔ اب اگر ان شعرا کے پیش نظر بشیر بدر کو رکھ کر دیکھیں تو ان کا معاملہ ان سے بہت مختلف نظر آتا ہے۔ انھوں نے عوامی جذبات کو برانگیختہ کرنے والے سیاسی و سماجی موضوعات سے خود کو عام طور سے دور رکھا، اور جہاں ایسے مضامین کو استعمال بھی کیا تو اس بات کا لحاظ رکھا کہ بات بالکل نعرہ نہ بن جائے بلکہ اس میں شعری تاثیر کچھ نہ کچھ قائم رہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھئے:

کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے یہاں فاصلے سے ملا کرو

اسی مضمون کو ایک جگہ اس طرح بیان کیا ہے:

محبتوں میں دکھاوے کی دوستی نہ ملا
اگر گلے نہیں ملتا تو ہاتھ بھی نہ ملا

یہ دونوں شعر فنی لحاظ سے بہت قابل ذکر نہیں کہے جا سکتے، اور دوسرا شعر تو بہت معمولی کہا جائے گا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان اشعار کو جب بھی عوام کی محفل میں پڑھا جائے گا تو ان کا پسند کیا جانا لازمی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان میں جو خیال بیان ہوا ہے، وہ عوام الناس کے تجربے کا ایسا حصہ ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن جیسا کہ صاف دیکھا جا سکتا ہے، یہاں عام تجربے کو عوام کی سطح پر رکھ کر تو بیان کیا گیا ہے، لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کے ذریعے شاعر نے سننے والوں کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی ہے۔ کچھ مزید اشعار ملاحظہ کیجئے:

مجھ میں رہتا ہے کوئی دشمن جانی میرا
خود سے تنہائی میں ملتے ہوئے ڈر لگتا ہے

زندگی تو نے مجھے قبر سے کم دی ہے زمیں
پاؤں پھیلاؤں تو دیوار میں سر لگتا ہے

.....

عجب چراغ ہوں دن رات جلتا رہتا ہوں
میں تھک گیا ہوں ہوا سے کہو بجھائے مجھے

.....

مرے پاس جتنی ہے روشنی ہے یہی چراغ کی زندگی
میں کہاں جلا میں کہاں بجھا یہ کبھی کسی کو خبر نہ ہو

بشیر بدر کی غزلوں کے عام لہجے پر جو کیفیت سب سے نمایاں نظر آتی ہے اسے غم کی زیریں لہر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس کیفیت میں جگہ جگہ ایسے نقوش بھی دکھائی دیتے ہیں جنھیں عشق کے داخلی تجربے کی تجسیم کہنا مناسب ہوگا۔ یہ داخلی تجربہ ان کے یہاں اکثر انسان کے ذاتی وجود کے حوالے سے بیان ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں ضمیر واحد متکلم کا استعمال زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ یہاں اس بات کی طرف توجہ دلانا شاید مناسب ہوگا کہ جس زمانے میں بشیر بدر کی شاعری نمایاں ہونا شروع ہوئی وہی زمانہ اردو میں جدیدیت کے فروغ کا تھا۔ جدید طرز فکر کی مقبولیت کا اس وقت یہ عالم تھا کہ بہت سے لوگ فیشن کے طور پر اس طرز فکر کو اختیار کرنے کی طرف مائل ہوئے۔ اب یہ کہنا تو شاید مبنی بر حقیقت نہ ہوگا کہ بشیر بدر کی غزلوں میں جدید طرز فکر کی جو کارفرمائی جا بجا نظر آتی ہے وہ فیشن کے طور اختیار کردہ تھی، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انھوں نے جدید فکر کے ساتھ جدید طرز اظہار کو بھی شعوری طور پر اختیار کرنے کی کوشش کی اور اس میں ایک حد تک کامیاب ہوئے۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ ان کے یہاں جو داخلی اور ذاتی طرز اظہار کی کثرت ہے، وہ جدید نظریۂ شعر کا مرہون منت ہے۔ بشیر بدر نے خود بھی اس کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے مجموعے ''اکائی'' کے ابتدائیہ بعنوان ''نوٹس'' کے تحت لکھا ہے:

اس مجموعے میں ۱۹۵۶ سے ۱۹۶۹ تک کی غزلوں کا انتخاب ہے۔ ترتیب غیر تاریخی ہے۔ غزلوں کی سن پیدائش (کے سنہ پیدائش' ہونا چاہیے) کا کچھ اندازہ رسائل میں ان کی اشاعت سے ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں نقوش لاہور، نیا دور کراچی، سویرا، محمود ایاز کا سوغات، نریندر نشچل کا محور، اسکے بعد شب خون اور کتاب مددگار رہوں گے۔

یہاں جن رسائل کا ذکر ہوا ہے، وہ بذات خود اس بات کا ثبوت ہے کہ بشیر بدر نے خود کو جدید شعری منظر نامے سے وابستہ کرنے کا کھلا اعتراف کیا ہے۔ یہاں یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ جب ان کا کلام ایسے نمائندہ رسائل میں شائع ہوتا رہا تو انھیں دیگر جدید شعرا کی صف میں جگہ کیوں نہیں ملی؟ اس کا

ایک جواب تو یہی ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں جدید لب ولہجہ اختیار کرنے اور طرز اظہار میں کچھ خاص طرح کا نیا پن پیدا کرنے کے باوجود خود کو مشاعرے کے میدان سے زیادہ وابستہ رکھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان کو غیر معمولی مقبولیت مشاعرے کی دنیا ہی میں حاصل ہوئی۔ چونکہ مشاعرے میں بڑی کامیابی عموماً خاص طرح کی شاعری کا تقاضا کرتی ہے، اور اس میں کلام کا انداز پیش کش بھی بہت اہم کردار ادا کرتا ہے، اس لیے بشیر بدر نے ان باتوں پر خصوصی توجہ صرف کی، جس کا نتیجہ ان کی بے انتہا شہرت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اس کے علاوہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، انھوں نے اپنی غزلوں میں اس بات کا شعوری طور پر زیادہ خیال رکھا کہ عشقیہ مضامین کچھ نئی لفظیات کے ساتھ اس طرح بیان ہوں کہ وہ عوام کے جذبہ واحساس کا حصہ بن سکیں۔ مثال کے طور پر ان کے مجموعۂ کلام ''آسماں'' سے ان اشعار کو ملاحظہ کیجئے:

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں
ہر دھڑکتے پتھر کو لوگ دل سمجھتے ہیں
عمریں بیت جاتی ہیں دل کو دل بنانے میں

اس دوسرے شعر کے سامنے میر کے یہ اشعار رکھیے تو اصل اور نقل کا فرق واضح ہو جائے گا:

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کر

.....

دل میں رہ دل میں کہ معمار قضا سے اب تک
ایسا مطبوع مکاں کوئی بنایا نہ گیا

''آسماں'' سے ہی کچھ اور اشعار دیکھئے:

ہر اک چراغ کی لو ایسی سوئی سوئی تھی
وہ شام جیسے کسی سے بچھڑ کے روئی تھی
نہا گیا تھا میں کل جگنوؤں کی بارش میں
وہ میرے کاندھے پہ سر رکھ کے خوب روئی تھی
یہ بھی ممکن ہے کہ میں نے اس کو پہچانا نہ ہو
اب اسے دیکھے ہوئے کتنے زمانے ہو گئے

.....

پہلے انٹیں پھر دروازے اب کے چھت کی باری ہے
یادنگر میں ایک محل تھا وہ بھی گرتا جاتا ہے

.....

ہم دونوں دنیادار نہیں ہیں اسی لیے
صورت کوئی نظر نہیں آتی نباہ کی

.....

میں نے دریا سے سیکھی ہے پانی کی پردہ داری
اوپر اوپر ہنستے رہنا گہرائی میں رو لینا

درج بالا آخری شعر بشیر بدر کے نہایت مشہور شعروں میں شامل ہے۔ اس کے پہلے مصرعے میں لفظ 'پانی' کی جگہ ان کی زبان سے اکثر 'آنسو' سنا گیا ہے۔ بہر حال ان اشعار سے جو عام تاثر قائم ہوتا ہے، اسے گہرے تخلیقی تجربے کا زائیدہ نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کہیں کہیں انھوں نے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو غزل کی روایت کے باہر ہیں۔ عام بول چال کے انگریزی الفاظ کا شعوری استعمال بھی ان کے یہاں نظر آتا ہے جو غزل کے روایتی طرز اظہار کا حصہ نہیں سمجھا جاتا۔ تاہم اس طرح کی جدت کو صرف بشیر بدر سے منسوب نہیں کیا جا سکتا، کیوں کہ جدیدیت کے عروج کے زمانے میں اس طرح کے تجربے کچھ دیگر جدید غزل گویوں کے یہاں زیادہ کامیاب صورت میں نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں سردست ظفر اقبال اور سلیم احمد کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔

بشیر بدر کی غزلوں کا مجموعہ ''امیج'' جو ''اکائی'' کے بعد منظر عام پر آیا، اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ اس میں شامل غزلیں طرز اظہار کے اعتبار سے بڑی حد تک اپنے الگ ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جدید طرز فکر اور جدید پیرایۂ بیان کا سب سے گہرا اثر اسی مجموعے کی غزلوں میں نمایاں ہوا ہے۔ یہاں جدید عہد کی سفاکیوں کے علامتی بیان کے ساتھ انسان کی محرومیوں اور اس کے وجود کی لایعنیت کو بالواسطہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ یہاں کچھ ایسے علامتی اور استعاراتی پیکر لائے گئے ہیں جو جدید شاعری کی مخصوص شناخت سمجھے گئے ہیں۔ اس مجموعے سے کچھ اشعار بطور مثال دیکھیے:

یہ لکڑیاں جو خشک ہیں بے برگ وبار ہیں
ان کو میں اپنی آگ میں جلنا سکھاؤں گا
اس دن بجائے اوس کے ٹپکے گا سرخ خون
تلوار لے کے جب میں خلاؤں میں جاؤں گا

.....

اپنی جگہ جمے ہیں کہنے کو کہہ رہے تھے
سب لوگ ورنہ بہتے دریا میں بہہ رہے تھے

.....

ہمراہ چلو میرے یا راہ سے ہٹ جاؤ
دیوار کے روکے سے دریا کہیں رکتا ہے

یہ اشعار حقیقی معنی میں اپنے جدید ہونے کا نہ صرف اعلان کر رہے ہیں، بلکہ اس خیال کو تقویت بھی پہنچا رہے ہیں کہ بشیر بدر کی ادبی حیثیت کو قائم کرنے میں ان کے اس مجموعے یعنی ''امیج'' کا اہم کردار رہا ہے۔

بشیر بدر مشاعرے کی دنیا کے ان چند خوش نصیب شعرا میں ہیں جن کو بے انتہا شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی، اور وہ اس لحاظ سے بھی ممتاز کہے جا سکتے ہیں کہ ان کے کئی اشعار عوامی مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ بشیر بدر اس وقت اپنی عمر کی آٹھ دہائیاں گذار چکے ہیں اور ایک عرصے سے صاحب فراش ہیں۔ میں ان کی صحت وسلامتی کے لیے دعا گو ہوں اور ان کے اس مشہور شعر پر اپنی گفتگو کو ختم کرتا ہوں:

اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

❑❑❑

بشیر بدر کا قیام سیتاپور
اکائی کی آمد آمد کا تخلیقی محور

مست حفیظ رحمانی

کہنہ مشق شاعر

ادب اور صحافت میں

مساوی طور پر سرگرم

بزم اردو کے روح رواں

سماجی کاموں میں بھی شمولیت

صدر جمہوریہ ایوارڈ

برائے بہترین اردو ٹیچر

271A، میر دہی ٹولہ

اولڈ ٹاؤن، سیتاپور

رابطہ: 9208056163

آزادی کے بعد کا وقت، ہندوستان کی تعمیر نو کا زمانہ تقریباً ۱۹۵۷ء کا ہے۔ زمینداری کا خاتمہ ہو چکا تھا مگر ابھی زمینداری کا شفق روشن تھا اور اسی روشنی میں اسی اہتمام سے شعر و شاعری کی محفلیں آراستہ ہوتی تھیں جہاں گفتگو کرنے کا انداز، اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ، بزرگوں کا احترام، برابر والوں سے رواداری، ہنسی مذاق (تہذیب کے دائرے میں) چھوٹوں سے محبت و شفقت کا درس، ان کی حوصلہ افزائی، شعری خوبیوں اور خامیوں کا ذکر، علمی، ادبی اور تاریخی بات چیت اور کبھی کبھی بحث و مباحثہ بھی ہوتا رہتا تھا۔

میر کلوعرش کے مطابق سیتاپور کی کنکریاں بھی موزونیت کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ اس کے ہر گلی کوچہ میں شاعر آباد تھے۔ نواب ابراہیم حسین ملا سیتاپوری، کنور سورج نارائن ادب سیتاپوری کی کوٹھی، گرچرن لعل شیدا نبی نگری، بابا رام سروپ ضبط سیتاپوری، امجد عربی ایڈوکیٹ، حیات سندیلوی کے مکانوں پر آئے دن شعری نشستیں ہوا کرتی تھیں لیکن زیادہ تر طرحی نشستوں کا ہی رواج تھا۔ اسی زمانہ میں آغا معین الدین شاہ میرٹھی ایس پی تھے اور اکثر مشاعروں کی صدارت کرتے تھے اور اردو زبان اور شاعری کی اہمیت پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اسے مشترکہ تہذیب اور قومی یکجہتی کی پہچان بتاتے۔ ہندی بھی بہت اچھی بولتے تھے اور دونوں زبانوں کے اشتراک پر توجہ دیتے تھے۔ یہ زمانہ وہ تھا جب نواب ابراہیم حسین ملا سیتاپوری، مسعود لکھیم پوری، آغاز شہپر لکھنوی، عشق لکھنوی، گرچرن لعل شیدا نبی نگری، حشر سیتاپوری، اسد رحمانی، محسن خیرآبادی، عارف سیتاپوری، وصی سیتاپوری، ساجد شاہجہانپوری، ضبط سیتاپوری، بسمل سیتاپوری، جگت نارائن رونق ثمر سیتاپوری اور بہت سے ہندو شاعر اور مزاحیہ شاعر شرکت کر کے رات کو صبح تک لے آتے تھے۔ قاضی عبدالستار، ابوالحسن نغمی، رشید کوثر فاروقی، احمر سیتاپوری (حسن عابد)، فضل حق شہر سے ہجرت کر چکے تھے لیکن شہر میں مسلسل آمد و رفت رہتی تھی۔ اس کی ایک وجہ ادبی بھی تھی۔

ڈاکٹر صفدر آہ، ڈاکٹر نادم سیتاپوری باہر تھے مگر آنا جانا تھا۔ ایک نیا گروپ محمد احمد رمز، رندر حمانی، وفا سیتاپوری، بہار سیتاپوری، احسن رضوی، شکیب رضوی، احمد وصی، نقی سیتاپوری، حیدر علی جعفری، کیف احمد کیف، نور سیتاپوری، طاہر سیتاپوری، سحر سیتاپوری کا ابھر رہا تھا۔ حیات سندیلوی، مسعود حسن مسعود لکھیم پوری کی قیام گاہیں بھی شعر و ادب کا مرکز تھیں۔

شہر کی ادبی تنظیموں کو جب معلوم ہوا کہ پولیس دفتر میں کوئی نوجوان ہے جو شاعر بھی ہے تو لوگ اس طرف متوجہ ہوئے۔ بشیر الدین ایس پی آفس سیتاپور میں اکاؤنٹنٹ تھے۔ الٰہ آباد سے منتقل ہوکر آئے تھے۔ شہر کے تاریخی گھنٹہ گھر کے بالائی کمرے میں قیام تھا جہاں کسی زمانے میں حضرت جگر مرادآبادی بھی آکر قیام کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد میرے بھائی جان (رندرحمانی مرحوم) بشیر الدین کو اپنے محلہ میں لے آئے اور معروف رئیس اور غرباء پرور (حاجی محمد ضمیر عرفا دہا خاں) کے مکان کے ایک کمرے میں انہیں ٹھہرایا گیا۔

پی اے سی میں تعینات بشیر الدین کے بڑے بھائی ضمیر الدین جو بہت اچھے میلاد خواں اور نعت خواں بھی تھے، انہوں نے شہر میں اپنی ایک شناخت بنا رکھی تھی۔ ان کے توسط سے بشیر بدر سیتاپور کے ادبی حلقوں میں متعارف ہوئے۔ ضمیر الدین کی نسبت سے انہیں بشیر الدین ہی کہا جاتا تھا۔ انہوں نے کبھی اس کی تردید بھی نہیں کی۔ بشیر الدین بشیر بدر کے نام سے ان محفلوں کی رونق تھے۔ اچھی صورت، جاذب شخصیت، متاثر کرنے والی شاعری وہ بھی مخصوص انداز میں، بہت جلد وہ نشستوں کی زینت بن گئے اور نوجوانوں کے ہردل عزیز شاعر کہلاتے۔ لوگ بڑی توجہ سے ان کا کلام سنتے اور داد سے نوازتے تھے۔

پتھر کے جگر والوں غم میں وہ روانی ہے
خود راہ بنا لے گا بہتا ہوا پانی ہے

.....

گفتگو ان سے روز ہوتی ہے
مدتوں سامنا نہیں ہوتا
کچھ تو مجبوریاں رہی ہوں گی
یوں کوئی بے وفا نہیں ہوتا
جی بہت چاہتا ہے سچ بولوں
کیا کروں حوصلہ نہیں ہوتا
وہ بڑا رحیم و کریم ہے
مجھے یہ صفت میں عطا کرے

.....

تجھے بھولنے کی دعا کروں
تو دعا میں میری اثر نہ ہو

بشیر بدر کے ان اشعار میں سوسن، حسرت، فانی کا اثر دکھائی دیتا ہے لیکن سننے کے بعد دل میں اثر جانے کی کیفیت بھی ہے جس نے ان کو عوام و خواص میں مقبول بنا دیا۔ پولیس کا رعب، شاعرانہ انانیت، مذاق پرستی، کم سخن ہونے کے باوجود اپنی بات منوانے کی ضد نے جلد ہی انہیں یہاں کی ادبی محفلوں سے دور کر دیا لیکن نوجوانوں کے محبوب شاعر بن چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے اردو ادب کے نام سے ایک انجمن بنا ڈالی اور شعری نشستیں کرنے لگے۔ ان کے ساتھ کیف احمد صدیقی، نقی سیتاپوری، طاہر سیتاپوری اور کچھ بزرگ شاعر جو کسی بھی خیمے میں نہ تھے، شریک ہونے لگے۔ اسی زمانے میں ان کے اندر چھپے کرکٹر نے بھی جلوہ نمائی کی اور ایک اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے کھلاڑی بن گئے۔

اب ان کے خاندان کا ایک چھوٹا سا قافلہ اہلیہ، بہن، ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی جن کے لئے ایک کمرہ ناکافی تھا اس لئے انہوں نے شیخ سرائے میں ایک مکان کرائے کا لیا اور اسی میں رہنے لگے۔ بشیر بدر بہت ذہین تھے۔ مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ بہت رسائل ان کے پاس آتے تھے۔ انہیں یہاں کے ماحول سے گھٹن سی محسوس ہونے لگی تھی۔ انہوں نے شکستگی قبول کرنے کے بعد بھی حوصلوں کو نہیں ہارنے دیا۔ میرے ساتھ ۱۹۶۳ء میں ادیب ماہر ۱۹۶۴ء میں ادیب کامل کا امتحان خیرآباد مرکز سے ممتاز درجہ میں پاس کیا۔ ان کا تبادلہ لکھیم پور ہو گیا لیکن انہوں نے جامعہ اردو کے راستے گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کرکے پی ایچ ڈی کی ڈگری مسلم یونیورسٹی سے ممتاز درجہ میں حاصل کی۔ وہ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر بھی رہے۔ اس میں پدم شری قاضی عبد الستار صدر شعبۂ اردو کا بہت بڑا تعاون رہا۔ پولیس کی ملازمت ترک کر دی۔ میرٹھ یونیورسٹی میں پہنچے اور پروفیسر بنے۔ آج دنیا ڈاکٹر بشیر بدر کو جانتی ہے۔ ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں لیکن انہوں نے سیتاپور کی ادبی محفلوں کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا۔ ڈاکٹر بشیر بدر شاعر ہیں، قابل قدر بھی ہیں اور قابل ذکر بھی۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ پھر بھی ان کے یہاں حمد، نعت، منقبت اور دوسری اصناف بھی پائی جاتی ہیں۔ بشیر بدر صرف غزل کے شاعر ہیں۔ غزل ہماری شاعری کی آبرو ہی نہیں ہماری زبان، سماج اور ثقافت کی بھی آبرو ہے۔ بشیر بدر نے اسی اعتبار سے غزل کا استعمال کیا ہے۔ وہ غزل کے سچے عاشق ہیں۔ اسی زبان میں ہر طرح کی گفتگو کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ خدا کی وحدانیت کا اقرار، عشق رسول اکرم کا اظہار اور مدینہ منورہ کا دیدار نے کرنے حسرت رکھتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ کریں:

خدا مجھ کو ایسی خدائی نہ دے
کہ اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے
خدا ایسے احساس کا نام ہے
رہے سامنے اور دکھائی نہ دے
میں اشکوں سے نام محمد لکھوں
قلم چھین لے روشنائی نہ دے
مجھے ایسی جنت نہیں چاہئے
جہاں سے مدینہ دکھائی نہ دے

ان اشعار میں صرف عقیدت ہی نہیں ندرت بھی ہے جو غزل کا شاعر ہی بیان کر سکتا ہے۔ بشیر بدر غزل کے عاشق ہیں یا غزل نے بشیر بدر سے عشق کیا اور ساتھ ساتھ رہنے کا عہد بھی۔ ان کے کلام پر

اعتراضات بھی ہوئے۔ جبریہ، عروضی خامیوں کی طرف اشارہ کیا گیا مگر وہ اپنی منزل کی طرف آگے ہی بڑھتے رہے اور آج وہ ان بلندیوں پر فائز ہیں جہاں تک دیکھنے اور رسائی کے لئے حوصلہ کی ضرورت ہے۔

ان کی شاعری کا ابتدائی دور سیتاپور میں ہی گزرا۔ ان کے مجموعے کی فہرست دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ 'اکائی' ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا یعنی قیام سیتاپور کے دوران جو اشعار انہوں نے کہے وہی 'اکائی' کا حصہ ہیں اور 'اکائی' نے ان کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ بشیر بدر کے سیتاپور کے قیام کے دوران ہی ان کا کلام شائع ہونے لگا تھا مگر ابھی باہری مشاعروں سے وہ کوسوں دور تھے۔ کنور سورج نارائن سنہا ادب سیتاپوری کی حویلی میں روز ہی نشستیں ہوتی تھیں جن میں سراج لکھنوی، مہذب لکھنوی، سالک، حکیم شارب منظر، محضر ناصر، دل لکھنوی، انور چغتائی، وسیم بریلوی، شارب ردولوی، نسیم شاہجہانپوری، ذکی شیرازی، حباب تبریزی اور بہت سے نامور شعراء اسی طرح شرکت کرتے تھے جیسے وہ سیتاپور کے کسی محلے میں آباد ہوں اور ایک آواز میں آجاتے ہوں۔

بشیر بدر کو بڑے شاعروں میں کس نے متعارف کرایا، یہ ایک الگ واقعہ ہے لیکن انہیں شعراء کے توسط سے وہ مشاعروں میں پہنچے۔ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کے مشاعروں میں سب سے زیادہ کامیاب ہونے والوں میں منظر سلیم اور بشیر بدر تھے۔

منظر سلیم مرحوم کا یہ شعر:

جی رہا ہوں دوسروں کے ذہن میں
موت مرنے سے مجھے روکے گی کیا

اور بشیر بدر کا یہ شعر:

آنکھیں آنسو بھری پلکیں بوجھل بنیں
جیسے جھیلیں بھی ہوں نرم سائے بھی ہوں
یہ تو کہئے انہیں کچھ ہنسی آ گئی
بچ گئے آج ہم ڈوبتے ڈوبتے

سیتاپور چھوٹا سا ایک دبستان ادب رہا ہے جہاں مختلف شعبۂ حیات میں کارنامہ انجام دینے والے پیدا ہوئے وہاں یہ بھی فخر حاصل ہے کہ تعلیم کے سلسلہ میں جوش ملیح آبادی، مولانا عبد الماجد دریا آبادی، مرکزی وزیر تعلیم نورالحسن، پروفیسر آل احمد سرور، معین احسن جذبی کا قیام رہا ہے تو معاشی اعتبار سے ملازمت کے سلسلہ میں سکندر علی وجد، وصل بلگرامی، اقبال صفی پوری، شاعر لکھنوی، کیفی، قمر، اقبال رائے بریلوی، انجم فاروقی، واصف فاروقی، اشتیاق علی صبا کے نام قابل ذکر ہیں۔ غالب، مومن، سرسید کی قرابت داریاں رہی ہیں تو آتش، مصحفی، امیر مینائی، داغ دہلوی کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ جب دبستان سیتاپور کی ادبی تاریخ مرتب ہوگی تو کوئی بشیر بدر کو نظر انداز نہیں کر سکتا ہے۔ دنیا کی ہر بڑی زبان کا ادبی سرمایہ اس کی عظمت و رفعت کو ظاہر کرتا ہے۔ اردو زبان کا بھی ادبی سرمایہ اس کی شناخت ہے اور بہت جلد اس نے دوسری زبانوں میں بیٹھنے کا سلیقہ سیکھ لیا ہے۔

اردو میں اگر غالبؔ و اقبالؔ نہ ہوتے
ہم کرتے ابھی حافظؔ و خیامؔ کی پوجا
رندؔ رحمانی

اور یہ سارا معجزہ غزل کا ہے۔ غزل اپنے معنوی اعتبار سے کبھی بھی اسم با مسمیٰ نہیں رہی۔ اس نے زمانے اور سماج کے مزاج کے اعتبار سے اپنے پیراہن کو تبدیل کر کے لوگوں کو متاثر کیا ہے۔ جب امیر مینائی اور داغ دہلوی کے چراغ ٹمٹمانے لگے تو ایک انگریزی یافتہ گروپ نے ترقی پسند ادب کو رائج کیا۔ یہ تحریک بہت جلد عوام میں مقبول ہوئی لیکن جس چیز کا عروج بہت جلد ہوتا ہے اس کا زوال بھی اسی تیزی سے ہوتا ہے۔ پھر بھی جذبی، فیض، مجاز، ن م راشد، احمد ندیم قاسمی، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، جانثار اختر، معصوم رضا راہی کو کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ترقی پسند شاعری نے عروج کی منزلیں طے کیں لیکن ۱۹۶۰ء میں جدید شاعری میں دو لوگوں نے ایک نئی روح پھونک دی۔ خلیل الرحمن اعظمی نے غزل کو نیا مزاج اور شمس الرحمن فاروقی نے فکروں کا جہان عطا کیا اور نئے لب و لہجہ سے آشنا کرایا تو ایک قافلہ چل پڑا جس میں شہریار، عادل منصوری، محمد علی، افتخار امام، احمد فراز، ندا فاضلی، کیف احمد صدیقی، محمد احمد رمز کے بھی نام شامل ہوئے لیکن بشیر بدر کچھ الگ ہٹ کر چلے۔ ان کی راہ منفرد تھی اور انہوں نے جو راہ اختیار کی، جلد ہی اس راہ کے رہبر بن گئے۔ انہوں نے جدید غزل کو جو سرمایہ دیا ہے، وہ قیمتی ہے۔ اگر انانیت اور زر پرستی کا شکار نہ ہوتے تو شاید دور دور تک ان کا کوئی ہمسر نظر نہ آتا۔ پھر بھی ان کے اشعار زندہ رہیں گے اور بشیر بدر کا اردو شاعری میں ایک ستارہ کی مانند چمکتا رہے گا۔

یہ غزل کا لہجہ نیا نیا
نہ کہا ہوا نہ سنا ہوا

.....

چاند سا مصرعہ اکیلا ہے مرے کاغذ پر
چھت پہ آ جاؤ مرا شعر مکمل کر دو

.....

یہاں لباس کی قیمت ہے آدمی کی نہیں
مجھے گلاس بڑا دے شراب کم کر دے

.....

بڑے لوگوں سے ملنے میں ہمیشہ فاصلہ رکھنا
جہاں دریا سمندر سے ملا دریا نہیں رہتا

.....

رات تیری یادوں نے دل کو اس طرح چھیڑا
جیسے کوئی چٹکی لے نرم نرم گالوں میں

.....

کوئی ہاتھ تک نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو

❑❑❑

میں دکھوں کے پھول چنا کروں
مری سلطنت مرا فن رہے

ریشماں پروین

تنقید نگار، پانچ کتابوں کی مصنفہ

ادبی رسائل، ریڈیو، سیمینار وغیرہ میں

شمولیت، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

سے ڈاکٹریٹ۔ فی الحال

کھن کھن جی گرلس انٹر کالج لکھنؤ میں

صدر شعبۂ اردو کے عہدہ پر فائز،

وطن علی گڑھ

C-95، سیکٹر ای، علی گنج لکھنؤ

رابطہ: 7565086830

طالب علمی کے دوران اکثر کتابوں میں یہ جملہ پڑھا تھا کہ آفاقی ادب ہر زمانے میں زندہ رہتا ہے کیونکہ اس کی تخلیقی رو میں تین زمانے ماضی، حال اور مستقبل بہتے ہیں۔ اس وقت تو دوسرے طلباء کی طرح یہ بات صرف کچھ دیر کے لئے ہی دماغ میں گردش کرتی اور پھر دوسرے موضوعات، مضامین اپنی طرف متوجہ کر لیتے لیکن جیسے جیسے مطالعہ بڑھتا گیا اس جملے کی معنویت روشن ہونے لگی، میر و غالب جیسے کلاسیکی شعراء کے کلام کی ہر عہد میں مقبولیت نے احساس دلایا کہ یہ جملہ واقعی اپنے اندر کس قدر گہرائی سمیٹے ہے۔

اس میں شک نہیں کہ آفاقی ادب زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتا ہے اس لئے اس میں ماضی کے حوالے، حال کی صورت اور مستقبل کی روح، مزاج اور ادبی تقاضے واضح طور پر جھلکتے ہیں، اسی خیال نے نہ جانے کیوں دل میں یہ کسک پیدا کی کہ کیوں نہ جدید شعراء کے یہاں اس عنصر کی تلاش کی جائے خصوصاً بیسویں صدی میں پروان چڑھنے والے شعراء کے یہاں غور و خوض کے بعد یہ طے ہوا کہ اس سلسلے میں اپنے کسی پسندیدہ شاعر، کا ہی انتخاب کیا جائے۔

بشیر بدر کے تخلیقی عروج کا زمانہ بیسویں صدی ٹھہرتا ہے تو کیوں نہ اکیسویں صدی میں اس کی تفہیم خصوصاً نئی نسل کے حوالے سے کی جائے۔ کیونکہ بشیر بدر نے بیسویں صدی کے آخر اور اکیسویں صدی کی تقریباً دو دہائیوں کو جیا ہے خصوصاً بیسویں صدی بشیر بدر کی ذہنی و دماغی نشوونما کا زمانہ ہے تقریباً 82 سال کے اس وقفہ میں نہ صرف عالمی تناظر میں بلکہ خود ہندوستان میں بڑے بڑے واقعات و سانحات ظہور پذیر ہوئے۔

بشیر بدر ہندوستان کی آزادی کے وقت تقریباً دس بارہ برس کے ہونگے۔ آزادی کے فوراً بعد تقسیم کا المیہ، قتل و غارت گری، بابری مسجد کی شہادت اور سیاسی منظرنامے پر تیزی سے بدلتے حالات۔ سب سے بڑا سانحہ تو خود اس کے ساتھ ہوا کہ میرٹھ کے فرقہ وارانہ فسادات میں شر پسندوں نے اس کا سارا اثاثہ اور گھر بار نذر آتش کر دیا۔ ایسے حالات میں بشیر بدر کے کلام کے موضوعات آنے والے شعری منظرنامے کیلئے ایک فکری منشور کی حیثیت رکھتے ہیں کلیات ہاتھ میں آتے ہی ایک پوری غزل اکیسویں صدی کی ردیف لئے متوجہ کرتی نظر آئی:

آہن میں ڈھلتی جائے گی اکیسویں صدی
پھر بھی غزل سنائے گی اکیسویں صدی
تہذیب کے لباس اتر جائیں گے جناب
ڈالر میں گنگنائے گی اکیسویں صدی

اس پوری غزل کے ہر شعر کے مطالعہ کے وقت بشیر بدر کی اس خوبی پر نظر ٹھہر گئی کہ بیسویں صدی کے اس شاعر نے کتنی صحیح پیشین گوئیاں کی ہیں اکیسویں صدی آہن میں تو ڈھلی ہی ہے تہذیب سے بھی بیگانی ہے ہمارا معاشرہ ہماری خصلتیں، مصنوعی محبتیں، ہر وقت کچھ اور پانے کی کسک نے جیسے ہم سبھی کو مجسم آہن کر دیا ہے کہاں ہے؟ وہ انسیت جس کے متلاشی ہم سب ہیں کہاں ہے؟ وہ مہذب سماج جسمیں ہمیشہ احترام و محبت کو اولیت حاصل تھی۔

سوچا تو یہی تھا کہ اپنے پسندیدہ شاعر کے مجھے خاصے اشعار یاد ہیں تو ان پر لکھنا میرے لئے مشکل نہ ہوگا۔ مگر جب لکھنے بیٹھی تو بشیر بدر کی شعری دنیا کی تہ در تہ معنوی جہات تک رسائی جوئے شیر ہوگئی، سہل ممتنع کی خوبی کے باوجود ان کے کلام کی معنوی گہرائیاں مجھے دور تک اپنے ساتھ لے گئیں اور پھر سے اشعار مجھ سے گفتگو کرنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں دیکھو ہم کو پڑھو کیا آج یہی سب کچھ نہیں ہو رہا ہے؟

بس ایک شام کی لذت بہت غنیمت جان
عظیم پاک محبت، ہر اک کے بس کی نہیں

.....

آج کی شام دوبارہ کبھی نہ آئے گی
آج کی شام یہ مت سوچ کہ کل کیا ہوگا

.....

اسے کسی کی محبت کا اعتبار نہیں
اسے زمانے نے شاید بہت ستایا ہے

.....

رات کا انتظار کون کرے
آج کل دن میں کیا نہیں ہوتا

عجب حالات تھے یوں دل کا سودا ہوگیا آخر
محبت کی حویلی جس طرح نیلام ہو جائے

.....

پاس رہ کر بھی دور دور رہے
ہم نئے دور کی محبت تھے

.....

صبح وصال پوچھ رہی ہے عجب سوال
وہ پاس آگیا کہ بہت دور ہوگیا

محبت کا اعتبار نہ ہونا، عجیب حالات میں دل کا سودا ہونا، عظیم پاک محبت کا فقدان آج ہماری زندگی کا ایسا کڑوا سچ ہے جس سے س ہم سب گذر رہے ہیں گذر کیا رہے ہیں ایک ایسی زندگی جی رہے ہیں جہاں محبت کی پاکیزگی ہوس پرستی میں سمٹ کر رہ گئی ہے خصوصاً ہماری نسلِ نو تو بس ایک شام کی لذت کو ہی غنیمت سمجھتی ہے جب دن میں ہی سارے کام ہوجاتے ہیں تو رات کا انتظار کرنا ضروری تو نہیں، کوئی اسے جنس پرستی کہے تو کہے لیکن بشیر بدر نے اپنے اشعار میں عصمت اور منٹو، کی طرح بہت سی کڑوی سچائیوں سے پردہ اٹھا دیا ہے عہد حاضر میں زندگی بھر ساتھ رہنا اسے نبھانا مشکل، اس پر بے سمتگی کہ یہ بھروسہ ہی نہیں کب ملاقات ہوگی پھر میری نظر ایک شعر پر ٹھہر گئی:

پوچھا بہت جو ہم نے کس اور اب ملوگے
چٹکی میں ریت لے کر اس نے اڑا دیا ہے

شعر خود کہہ رہا ہے کہ اب تو زندگی اس ریت کی مانند ہوگئی ہے جس کو ہوا کے ساتھ اڑ جانا ہے۔ چٹکی میں ریت کا اڑ جانا کیسا محرک پیکر ہے جو بار بار ذہن میں نہ جانے کتنے سوال اٹھاتا ہے آخر یہ بے سمتگی کیوں ہے ابھی اس سوال کا جواب تلاش ہی کر رہی تھی کہ مزید ایک شعر نے متوجہ کرلیا

سنا ہے انہیں بھی ہوا لگ گئی
ہواؤں کے جو رخ بدلتے رہے

اس ہوا نے بے مروتی نے ان راستوں کو بھی مجسم سوالات بنا دیا جن پر محبت میں سرشار لوگ ساتھ ساتھ گزرتے تھے کیسا خوبصورت پیکر ہے، راستے روک روک کر سوال کر رہے اس پر سادہ و سلیس الفاظ کا استعمال دل پھر بشیر بدر کا قائل ہوگیا شعر نے بار بار خود کو پڑھنے پر مجبور کر دیا:

انہیں راستوں نے جن پر کبھی تم تھے ساتھ میرے
مجھے روک روک پوچھا ترا ہم سفر کہاں ہے

اتنی بے راہ روی کیوں؟ آخر پچھلے برسوں میں کس چیز نے ہمارے دل و دماغ کو اتنا بدل دیا کہ آج کوئی کسی کے ساتھ نہیں یہاں تک کہ ہم خود سے بھی بیگانے ہو گئے۔

انسانی نفسیات پر گہری چوٹ ہے اس شعر میں سچ بھلے ہی کڑوا ہو مگر سچ تو سچ ہے اور ہمارے شاعر کی خوبی یہ ہے کہ وہ اتنی بڑی بات کس آسانی سے کہ گیا:

ہمارے بدن بھی ہمارے نہیں
اسے چھو کے محسوس کیسے کریں گے
میں اسی گمان میں برسوں بڑا مطمئن رہا ہوں
ترا جسم بے تغیر مرا پیار جاوداں ہے

حال کے ساتھ مستقبل کی بے چینی پھر شاعر کو اداس کر دیتی ہے غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ بڑھتی ہوئی مادہ پرستی نے ہمیں کس حد تک تنہا کر دیا ہے۔ لوگ روزگار کی تلاش میں بڑے بڑے شہروں میں یا ملک سے باہر تنہا زندگی گزارنے پر مجبور ہیں جہاں کوئی پرسان حال نہیں سب ایک دوسرے سے ملتے ضرور ہیں مگر اپنی مجبوریوں اور مصلحتوں کے ساتھ ہماری نسل کے پاس تو اداسی بھی ہے آنے والی نسل صرف مشین ہوگی اس کے پاس نہ کوئی امید ہوگی اور نہ آسرا ہوگا:

آس ہوگی نہ آسرا ہوگا
آنے والے دنوں میں کیا ہوگا

خوشا یہ قدر تو ہے اس اداس نسل کے پاس
اداس بھی جو نہ ہوں گے وہ لوگ آتے ہیں
مشینیں چل رہی ہیں کوٹ پینٹ پہنے ہوئے
کسی کا نام محبت کسی کا نام وفا

.....

میں تجھے بھول جاؤنگا ایک دن
وقت سب کچھ بدل چکا ہوگا

.....

اس کی بھی مجبوریاں ہیں میری بھی مجبوریاں
روز ملتے ہیں مگر گھر میں بتا سکتے نہیں

.....

یہ رات پھر نہ آئے گی بادل برسنے دے
میں جانتا ہوں صبح تجھے بھول جاؤں گا

ایک سچا اقرار کہ وقت کے ساتھ میں تجھے بھول جاؤنگا ،موقع پرستی کے بادل اور ساتھ ہی صاف گوئی،کوئی وعدۂ وفا نہیں،نئی نسل کی ایماندارانہ قبولیت کو بھی بشیر بدر نے موضوع بنایا ہے۔عہد حاضر کے نوجوان کو نہ کسی کا انتظار ہے اور نہ وہ کسی کو اپنے لئے منتظر رکھنا چاہتا ہے وہ صرف ایک شب کے قیام کا قائل ہے:

اس کی زلفیں بہت گھنیری ہیں
ایک شب کا قیام اور سہی
زندگی کے اداس قصے ہیں
ایک لڑکی کا نام اور سہی

.....

دوسری کوئی لڑکی زندگی میں آئے گی
کتنی دیر لگتی ہے اس کو بھول جانے میں
اسے پکارا تو آنگن کی مہندی بول پڑی
پکارتے ہو انہیں رات کو کہاں گھر میں

.....

مری نگاہ مخاطب سے بات کرتے ہوئے
تمام جسم کے کپڑے اتار لیتی ہے
اکثر شراب پی کر پڑھتی تھی وہ دعائیں
ہم ایک ایسی لڑکی کے ساتھ رہ رہے تھے

ایسا لگتا ہے کہ جیسے بیسوی صدی نسل انسانی کو ترقی کے ساتھ اداسی بے چینی، بے قراری دے کر ان سے ذہنی و دماغی سکون چھین کر لے گئی بشیر بدر کہہ اٹھتے ہیں:

خوبصورت، اداس، خوفزدہ
وہ بھی بیسویں صدی کی طرح

بشیر بدر کے اس شعر سے قاری خود بخود اتفاق کر لیتا ہے کیا دیا ہے؟ پچھلی صدی نے دو عالمگیر جنگیں تقسیم وطن، آپسی یگانگت اور اتحاد کا خاتمہ اس کے نتیجہ میں فرقہ وارانہ فسادات، عدم استحکام ،کالا بازاری، کرپشن، جب ماضی ایسا ہے تو اکیسویں صدی کے حال و مستقبل سے کیا امید کی جاسکتی ہے؟ اسی لئے وہ کہہ اٹھتا ہے کہ خدایا میری صدی میں معجزہ کر دے ورنہ آج کے اس ہنگامہ خیز دور میں تو ضرورت ہر انسان کو بدلنے پر مجبور کر رہی ہے:

خدایا میری صدی میں بھی معجزہ کر دے
وہ پوچھتے ہیں کہ اس دور میں محبت کیا
کچھ دنوں بعد اس نے بھی ضرورت اوڑھ لی
کوئی لڑکی جب نئی آئی قیامت سی لگی

اپنی صدی کا غم بشیر بدر کو اکیسویں صدی میں بھی چین نہیں دیتا ،عہد حاضر اسے اور زیادہ تڑپا دیتا ہے وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے:

پھر سے خدا بنائے گا کوئی نیا جہاں
دنیا کو یوں مٹائے گی اکیسویں صدی

سب سے زیادہ تکلیف کا سبب لوگوں کی بے اعتنائیاں ہیں ،مصلحتیں جینے نہیں دیتیں ، عزیزوں کی بدلتی نظریں دل و دماغ کو ایسا کرب دیتی ہیں کہ بس:

کبھی یوں ملیں کوئی مصلحت کوئی خوف دل میں ذرا نہ ہو
مجھے اپنی کوئی خبر نہ ہو، تجھے اپنا کوئی پتہ نہ ہو
کبھی ہم بھی اسکے قریب تھے دل وجاں سے بڑھ کر عزیز تھے
مگر ایسے ملا ہے وہ کبھی پہلے جیسے ملا نہ ہو

بشیر بدر کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنا بھی احتساب کرتے ہیں آج کے حالات کے لئے وہ صرف نئی نسل کو مکمل ذمہ دار نہیں ٹھہراتے بلکہ خود ذمہ داری لیتے ہوئے کہتے ہیں:

پہچان اپنی ہم نے مٹا ئی ہے اس طرح
بچوں میں کو ئی بات ہماری نہ آئے گی

.....

کل رات میں تھا میرے علاوہ کو ئی نہ تھا
شیطان مرگیا تھا، فرشتے بھی سوئے تھے

.....

میں فرشتوں کی صحبت کے لائق نہیں
ہم سفر کوئی ہوتا گنہگار سا

کیا خوب بات کہی ہے کہ کل کی رات جو کچھ ہوا اس کا ذمہ دار صرف اور صرف میں ہوں نہ اس کے لیے شیطان ذمہ دار ہے نہ فرشتے یہاں بشیر بدر روایت میں اضافہ کرتے نظر آتے ہیں غالب نے کہا تھا:

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

مگر بشیر بدر تو صاف کہتے ہیں شیطان اور فرشتوں کو درمیان سے ہٹا کر اپنے افعال کی ذمہ داری خود لیتے ہوئے ان کا کرب عیاں ہونے لگتا ہے کہ ہم نے خود اپنی شناخت کھوئی ہے اس لئے اب ہماری نئی نسل ہم سے کسب فیض کیسے کرے؟ ہم نے تو مصلحتوں کا لبادہ اس حد تک اوڑھ لیا ہے کہ ہم اپنے ساتھ ہونے والے ظلم وستم پر بھی خاموش ہی رہتے ہیں:

بڑے شوق سے مرا گھر جلا، کوئی آنچ تجھ پر نہ آئے گی
یہ زباں کسی نے خرید لی، یہ قلم کسی کا غلام ہے

عصر حاضر کی بے یقینی عدم اعتمادی، نا آسودگی اورمحرومی بشیر بدر کے یہاں بھی پائی جاتی ہے اس کا سبب وہ حالات ہیں جنھوں نے فرد کا زندگی پر رہا سہا اعتبار بھی ختم کر دیا۔

ان کی شعری فکر میں انسانیت کی اعلیٰ قدروں اور تہذیبی اقدار کی شکست وریخت کا اظہار اور ملال بھی پایا جاتا ہے اور انسانی رشتوں اور سماجی رابطوں کے ٹوٹتے بکھرتے حالات کے خلاف احتجاج بھی ،تہذیبی اور ثقافتی ورثہ کا زوال شاعر کو یہ کہنے پر مجبور کر دیتا ہے:

محبتوں میں دکھاوے کی دوستی نہ ملا
اگر گلے نہیں ملتا تو ہا تھ بھی نہ ملا
بہت عجیب ہے یہ قربتوں کی دوری بھی
وہ میرے ساتھ رہا اور مجھے کبھی نہ ملا

.....

گھروں پر نام تھے ناموں کے ساتھ عہدے تھے
بہت تلاش کیا کوئی آدمی نہ ملا

بشیر بدر کی شاعری عہد حاضر کے اس انسان کا کرب ہے جو زندگی کی مشینی اقدار سے اکتا کر اس کے خلاف بغاوت کا متقاضی ہے مگر جب ناکام ہوتا ہے تو جھنجھلا کر اس کا ردعمل یوں سامنے آتا ہے:

غزلیں اب تک شراب پیتی تھیں
نیم کا رس پلا رہے ہیں ہم

ظاہری بات ہے نیم کا رس، پینے کے بعد زبان سے شیرینی نہیں تلخ حقیقت کا ہی اظہار ہوگا،غزل اردو شاعری کی ہر دل عزیز صنف ہے ،اس کی شعری فضا میں جو سکون وطمانیت ہے وہ کسی اور صنف میں نہیں لیکن یہی غزل اس وقت اپنی رنگینی ودلکشی ، لطافت وشگفتگی کھو دیگی جب اس کے کہنے والے کا دل وقت کی زیادتیوں کے سبب تڑپتا رہے گا خود بیسویں صدی کے اکثر شعراء کے ساتھ یہی ہوا۔ بشیر بدر کی بیقراری اضطراب اور بے چینی ملاحظہ کیجئے:

اس کی فطرت نہیں رک کے کوئی بات سنے
وقت آواز ہے آواز کو آواز نہ دو

لیکن اپنی فکری تازہ کاری انفرادیت اور اسلوب وانداز کی ندرت کی وجہ سے بشیر بدر یہاں بھی بڑا خوبصورت پیرایہ اختیار کرتے ہیں وقت کو بے بس قرار دیتے ہیں حالانکہ اقبال نے وقت کو سب سے بڑا پارکھ قرار دیا تھا روایت میں انفرادیت پیدا کرتے ہوئے بشیر بدر شعر کے دوسرے مصرعہ میں لفظ آواز کا استعمال تین بار کرتے ہیں لیکن اس خوبی سے پڑھنے والا عش عش کر اٹھتا ہے۔

آج ہم ہوں یا ہمارے بعد کی نسل سب کی خواہش ایک بہتر زندگی جینے کی ہے جس کے لئے ہم

اپنے تمام خواب،آرزوئیں،تمنائیں عزیز واقارب قربا ن کرنے کو تیار رہتے ہیں بشیر بدر کہتے ہیں:

آج ہم سب ایک بہتر زندگی کی دوڑ میں
کیسے کیسے خواب قبروں میں سلا نے آئے ہیں

امیجری دیکھے خوابوں کو قبروں میں سلا نا کیسا تکلیف دہ عمل ہے لیکن شاعر نے اسے ایک نئے اور اچھوتے انداز میں پیش کر دیا ہے، ہم اور ہماری بعد کی نسلیں صرف خوابوں کو ہی نہیں سلا رہی ہیں بلکہ اپنے جگر کے ٹکڑوں کو بھی خود سے الگ کرنے پر مجبور ہیں ۔ یہاں ہم کا صیغہ اجتماعیت کی علامت ہے کہ اس دور کا پورا معاشرہ عجیب کشمکش کا شکار ہے شاعر کی جزئیات نگاری کو سلام کہ معاشرے کی ہر دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

آتی ہو ئی ٹرین کے جو آگے رکھ گئی
اس ماں سے یہ نہ کہنا بقید حیات ہوں

.....

جمی ہے دیر سے کمرے میں غیبتوں کی نشست
فضا میں گرد ہے، ماحول میں کدورت ہے

بشیر بدر کے اکثر اشعار زبان زدعام وخاص رہے ہیں ہم موقع بہ موقع دوران گفتگو خود بخود ان اشعار کو پڑھنے لگتے ہیں بشیر بدر اردو شاعری کا ایسا درخشاں ستارہ ہیں جنھوں نے بیسویں صدی کی تمام صعوبتوں کو برداشت کرنے کے باوجود امید کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا،نئی نسل کی بے راہ روی پر تنقید ضرور کی مگر بزرگوں کی انا پرستی کے آگے ان کی مجبوریوں کو بھی سمجھا کہتے ہیں:

میں والدین کو یہ بات کیسے سمجھاؤں
محبتوں میں حسب اور نسب نہیں ہوتا

محرک پیکر، علامتیں،استعارے اور مخصوص شعری ترکیبیں ، بشیر بدر کے کلام کو دلکشی ورعنائی عطا کرتے ہیں اکیسویں صدی کے انسانی تقاضوں کا گہرا ادراک وشعور رکھنے والے بشیر بدر کو جب جب حالات اپنے حصار میں لینا چاہتے ہیں۔

مختصر مضمون میں بشیر بدر کی تمام شاعرانہ خصوصیات کو سمیٹنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے مندرجہ ذیل شعر ان کی شعری کائنات کا بخوبی احاطہ کرتا ہے جہاں غزل کی شبنمی آنکھ سے دکھوں کے پھول چنتے وقت فنکارانہ خوبی کو اپنا سب کچھ قرار دیا گیا ہے:

میں غزل کی شبنمی آنکھ سے یہ دکھوں کے پھول چنا کروں
مری سلطنت مرا فن رہے مجھے تاج وتخت خدا نہ دے

❑❑❑

بشیر بدر کی شاعری میں آفاقیت کے کچھ اہم رموز اور نکات

نور فاطمہ

جدید شعری تنقید و تحقیق کا نیا نام

مختلف ادبی جریدوں میں مضامین کی اشاعت، فی الحال مولانا آزاد یونیورسٹی کے لکھنؤ کیمپس میں اسسٹنٹ پروفیسر کے عہدے پر فائز

وطن دیوبند

سی ۹، ایچ پارک، عقب نیرا ہاسپٹل مہانگر ایکسٹنشن، لکھنؤ

رابطہ: 7417219897

اردو شاعری میں غزل ایسی واحد صنف سخن ہے جو ہر دور میں بے حد مقبول اور لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ غزل میں اشاراتی و رمزیاتی اظہار کی ایسی صلاحیت موجود ہوتی ہے جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کئے بغیر نہیں رہتی، ہر سننے اور پڑھنے والے کو غزل میں اپنا ذاتی تجربہ دکھائی دیتا ہے۔ اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ غزل ہر دور میں لوگوں کی ذہنی تسکین کا باعث بنی رہی ہے۔ غزل کے حوالے سے ان باتوں کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ اس مضمون کا موضوع بھی دور حاضر کے ہر دل عزیز شاعر بشیر بدر کی اس زبان زد خاص و عام شاعری سے ہے جو قارئین کے درمیان بے حد مشہور و معروف ہے۔

اردو غزل کے منظر نامے میں بشیر بدر کی شاعری کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ بشیر بدر کا شمار ان معدودے چند شاعروں میں کیا جاتا ہے جنہوں نے گذشتہ کئی دہائیوں سے اپنی دلکش شاعری کے ذریعہ ادب میں وہ مقام پیدا کیا جس کو حاصل کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ بشیر بدر شہرہ آفاق شخصیت کے حامل ہیں۔ ان کی شاعری اردو اور ہندی کے ادبی حلقوں میں یکساں طور بے حد مقبول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی ان کی شاعری کے کئی انتخاب منظر عام پر آچکے ہیں۔ بشیر بدر کی شاعری میں وہ تاثیر و قوت موجود ہے جو عوام و خواص دونوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نظر آتی ہے۔ عوام میں بشیر بدر کی شاعری کی مقبولیت اور شہرت کا انحصار بڑی حد تک مشاعروں پر بھی ہے۔ جہاں ایک طرف موصوف نے اپنے رچے ہوئے شعری مذاق سے ادبی حلقوں میں اپنی قابلیت کا لوہا منوایا تو وہیں دوسری جانب مشاعروں میں شرکت کر کے اپنے مخصوص انداز بیاں سے ان عام لوگوں تک رسائی حاصل کی جو ان کے اشعار کی گہرائی کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ ان کی شاعری کے متعدد مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جن میں اکائی، امیج، آمد، آسمان، آس اور کلیات بشیر بدر بھی شامل ہے۔ بشیر بدر کی شاعری ایک ایسا حسین گلدستہ ہے جس میں مختلف رنگ کے پھول قرینے سے سجائے گئے ہیں۔ ان کی شاعری کا لب و لہجہ منفرد ہے، طرز احساس نیا ہے، قابل قدر بات یہ ہے کہ روایت کا احترام بھی ہے اور عصر حاضر کے مسائل کا بیان بھی بہت خوبصورت پیرائے میں ملتا ہے۔ بشیر کی شاعری کے موضوعات گھسے پٹے اور فرسودہ نہیں معلوم ہوتے بلکہ خیالات، جذبات و احساسات اور فکری سطح پر تازگی اور نیا پن محسوس ہوتا ہے۔

یہ بات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ بشیر بدر کو خود اپنی مقبولیت کا اندازہ تھا غالباً اسی سبب شعری مجموعے ''آمد'' میں اپنی مقبولیت کے بارے میں مستقبل کے قارئین سے مخاطب ہوتے ہوئے اس طرح رقم طراز ہیں:

''آج ۱۹۸۵ کی غزل میں مجھ سے زیادہ مقبول اور محبوب شاعر بقید حیات نہیں۔۔۔آج غزل کے کروڑوں عاشقوں کا خیال ہے کہ میری ناچیز غزل نے اردو غزل کے کئی سو سالہ سفر میں نیا موڑ لیا ہے۔میرا اسلوب آج کی غزل کا اسلوب بن چکا ہے۔میں اعتراف کرتا ہوں کہ آپ کے عہد میں (۲۰۳۵) جو غزل رواں دواں ہے اس کا آغاز مجھ ناچیز کے چراغوں سے ہوا ہے۔''

اس طرح کی پیشین گوئی سے بشیر بدر کے بیان میں خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ خود ستائی کا انداز نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ظاہر سی بات ہے ان کی تحریروں میں یہ خود اعتمادی برسوں کی ریاضت اور مشاعروں میں ملی ناموری کا نتیجہ ہے۔پہلے ہی مجموعے ''اکائی'' میں انہوں نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ ان کا نظریۂ شعر کسی طے شدہ اصول اور تحریک کا پابند نہیں ہے۔ان کا ماننا ہے کہ:

''میری اور میری شاعری کی وفاداری کسی طے شدہ نظریے اور تحریک سے نہیں، جو لوگ جدیدیت کو طے شدہ، اجتماعی نظریات کی تحریک سمجھتے ہیں اسے میری اور میری شاعری کی واقفیت تک نہیں''

بشیر بدر کی شاعری میں زبان کا خوبصورت اور رچا ہوا استعمال قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرتا ہے۔انہوں نے اپنی شاعری کو مختلف و منفرد بنانے کے لئے مشکل پسندی کے بجائے سہل پسندی کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا۔لفظوں کی در و بست اور نشست و برخاست کے بہتر استعمال سے معمولی اشعار کو بھی فنی اعتبار سے غیر معمولی بنا دیا۔دور حاضر میں حد سے بڑھی ہوئی مادیت پر انحصار، اخلاقی اقدار کی تنزلی، سیاسی و سماجی حالات پر تبصرہ، عاشق و معشوق کے بدلتے ہوئے کردار اور مختلف تجربوں کو ایسی سادگی مگر پرکاری کے ساتھ بیان کیا کہ پڑھنے والے حیران رہ گئے۔مشکل بات کو آسانی سے لکھنے اور کہنے کا سلیقہ جس طرح سے موصوف کے کلام میں پایا جاتا ہے وہ فن اور سلیقہ شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے کلام میں ملتا ہو۔ ذیل میں کچھ ایسے اشعار پیش ہیں جن کو اردو ادب سے واقفیت رکھنے والا قاری ہی نہیں بلکہ شعر و ادب سے تھوڑی سی دلچسپی رکھنے والا انسان بھی جانتا ہے۔

شہرت کی بلندی بھی پل بھر کا تماشا ہے
جس ڈال پہ بیٹھے ہو وہ ٹوٹ بھی سکتی ہے

.....

پتھر کے جگر والو ں غم میں وہ روانی ہے
خود راہ بنا لے گا بہتا ہو اپانی ہے

.....

اسی شہر میں کئی سال سے میرے کچھ قریبی عزیز ہیں
انھیں میری کوئی خبر نہیں، مجھے ان کا کوئی پتہ نہیں

.....

سر جھکاؤ گے تو پتھر دیوتا ہو جائے گا
اتنا مت چاہو اسے وہ بے وفا ہو جائے گا

.....

دوسری کوئی لڑکی زندگی میں آئے گی
کتنی دیر لگتی ہے اس کو بھول جانے میں

ان تمام اشعار میں خیالات و جذبات کا اظہار بہت خوبصورت انداز میں ملتا ہے۔دور جدید میں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کو نہایت سادگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔پھر چاہے تعلقات میں توازن و اعتدال کی بات کہی گئی ہو یا زندگی کے بے ثبات ہونے کا بیان ہو، یا شہرت کی ناپائداری کا ذکر ہو یا شدت غم کی وجہ سے سخت سے سخت دل پسیجنے کا معاملہ ہو، یا مادیت اور نفسانفسی کے اس دور میں انسان کی مصروفیات کا ذکر ہو یا پھر عاشق کو محبت میں اعتدال کی تلقین ہو۔یقینی طور پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ مذکورہ بالا اشعار ان تمام لوگوں نے بھی پڑھے اور سنے ہوں گے جو شاعری سے برائے نام دلچسپی رکھتے ہیں۔

اگر ابتدائی دور سے ان کے شعری سفر کا جائزہ لیا جائے تو جو بات ان کو دوسرے شاعروں سے مختلف اور ممتاز بناتی ہے وہ ان کی زبان اور اس کو بیان کرنے کا ڈھنگ ہے۔ جب دوسرے جدید شاعر علامتوں اور مشکل پسندی سے کام لے رہے تھے تب بشیر بدر نے شاعری کو ایک نئی راہ پر گامزن کرتے ہوئے عام زبان میں عام زندگی کے چھوٹے چھوٹے تجربات کو اپنی شاعری کا اٹوٹ حصہ بنایا۔ان کی شاعری کا غالب حصہ ایسا ہے جس میں مشکل تراکیب اور بھاری بھرکم اصطلاحات سے احتراز کرتے ہوئے عوامی بول چال کو نہایت فن کاری کے ساتھ شاعری کے سانچے میں ڈھال دیا گیا ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان استعمال کرنے کے معاملے میں وہ نظیر اکبر آبادی کی روایت کے پاسدار نظر آتے ہیں۔اردو کے کلاسیکی شعرا میں اگر نظیر کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے دوسرے شاعروں سے خاصے مختلف ہیں۔ان کی پوری شاعری عوامی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے۔کم و بیش اسی طرح بشیر بدر نے بھی عوامی شاعری کو دنیا کے سامنے ایک منفرد اور انوکھے لب و لہجہ میں بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ان کے مشاہدے میں غیر معمولی گہرائی ہے وہ اپنے زمانے کے حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔عشق و محبت کا معاملہ ہو یا آج کی ابہام زدہ زندگی کے مسائل کی ترجمانی وہ اپنی بات کو فنکارانہ ڈھنگ سے پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔

بشیر بدر کی شاعری زندگی سے محبت کرنے کا

سلیقہ سکھاتی ہے اور دلوں میں جوش و ولولہ پیدا کرتی ہے۔ وہ شاعری میں زندگی کے اسرار و رموز کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے نرم و نازک جذبات و احساسات کو نادر تشبیہات اور پیکر تراشی کے ذریعہ بول چال کی زبان کو شعر کے قالب میں ڈھال دیا جس میں سبک روی اور آہستہ خرامی پائی جاتی ہے۔ جدت و تازگی کا احساس ہر جگہ نمایاں ہے۔

ذیل میں جو اشعار پیش کئے جا رہے ہیں ان سے بشیر بدر کی شاعری میں سادگی اور انفرادیت کا اندازہ بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے:

شام تک کتنے ہاتھوں سے گزروں گا میں
چائے خانے میں اردو کے اخبار سا

.....

دیوانہ وار مجھ سے لپٹ جائے گی ہوا
میں سرخ سرخ پھولوں میں جب مسکراؤں گا

.....

لوگ ٹوٹ جاتے ہیں ایک گھر بنانے میں
تم ترس نہیں کھاتے بستیاں جلانے میں

.....

پتھر مجھے کہتا ہے مرا چاہنے والا
میں موم ہوں اس نے مجھے چھو کر نہیں دیکھا

.....

گفتگو ان سے روز ہوتی ہے
مدتوں سامنا نہیں ہوتا

.....

کوئی کسی کا درد نہ جانے
سب کو اپنی اپنی پڑی ہے

.....

اس کا بھی کچھ حق ہے آخر
اس نے مجھ سے نفرت کی ہے

مذکورہ تمام اشعار میں ایک نوع کی سادگی اور بے لوث خیالات کا برملا اظہار دیکھنے کو ملتا ہے کہ کس طرح انہوں نے خاص بات کو مخصوص انداز کے ساتھ عام بول چال کی زبان میں ڈھال کر اپنی شاعری کو منفرد اور آسان بنا دیا ہے۔ یہاں تک کہ پڑھنے والوں کو احساس تک نہیں ہوتا کہ بڑی بات بھی سادگی مگر فنی چابکدستی کے ساتھ کہی گئی ہے۔ کہیں اپنے مفاد کے لئے کسی کو آسانی سے استعمال کرنے جیسی بات ہے تو کہیں پر کلاسیکی رنگ کا حسین امتزاج ہے تو کسی شعر میں انسان کے باطنی کھوکھلے پن کی بات کا بیان ہے تو کہیں پر آج کے دور میں سطحی سوچ، تنگ نظری اور اپنے فائدے کے لئے گرتا ہوا انسان کا معیار ہے تو کہیں تغزل کا انداز تو کہیں عشق و محبت میں ہونے والی جزوی تبدیلیوں کو صاف محسوس کیا جاسکتا ہے اور کہیں پر درد و کرب کا انداز دیکھنے کو ملتا ہے۔

بشیر بدر کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے انداز بیاں ایسا اختیار کیا ہے کہ پڑھنے اور سننے والے کے دل پر براہِ راست اثر ہوتا ہے اور اشعار ایک ہی قرأت کے بعد بہ آسانی یاد ہو جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں بلاغت کم اور فصاحت زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس طرح کے اشعار کی کثرت کو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ بشیر بدر نے شاعری کے انتخاب پر کافی زور دیا ہے۔ اس بات کا اندازہ خود بشیر بدر کے اس شعر سے لگایا جاسکتا ہے:

ہزار صفحوں کا دیوان کون پڑھتا ہے
بشیر بدر کوئی انتخاب دے جاؤ

بشیر بدر کی شاعری میں ہر رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔ زبان و بیان کی پختگی کا انداز ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری کا اصل حسن ان کے اظہار اور بیان میں مضمر ہے۔ اگر لہجے کی اتنی رنگا رنگی کسی شاعر کے یہاں موجود ہو تو ظاہر ہے مستقبل میں اس کے روشن ہونے کہ امکانات اور بھی بڑھ جاتے ہیں۔ ان کی شاعری خوبصورت خیال اور خوبصورت زبان کی شاعری ہے جو غم جاناں سے لے کر غم دوراں تک کا بہترین سفر ہے۔ بشیر بدر کی انفرادیت یہی ہے کہ وہ ایک معمولی سے تجربے کو بھی شدت کے ساتھ بیان کرنے کا فن جانتے ہیں۔ ان کی شاعری کے موضوعات نئے نہیں بلکہ ان کو بیان کرنے کا ڈھنگ انوکھا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار پیش ہیں۔

ہم دلی بھی ہو آئے ہیں لاہور بھی گھومے
اے یار مگر تیری گلی تیری گلی ہے

.....

ہم بھی دریا ہیں ہمیں اپنا ہنر معلوم ہے
جس طرف بھی چل پڑینگے راستہ ہو جائے گا

.....

یہ پھول مجھے کوئی وراثت میں ملے ہیں
تم نے میرا کانٹوں بھرا بستر نہیں دیکھا

.....

تمہارے ساتھ یہ موسم فرشتوں جیسا ہے
تمہارے بعد یہ موسم بہت ستائے گا

.....

مختصر باتیں کرو بے جا وضاحت مت کرو
یہ نئی دنیا ہے بچوں میں ذہانت ہے بہت

قارئین کے درمیان بشیر کی شاعری کی مقبولیت کا راز سادہ و سلیس زبان اور ان کی شاعری کے دھیمے لہجہ میں پوشیدہ ہے غالباً اسی سبب ان کے اشعار زبان زد ہو کر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ ان معروضات کی روشنی میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ بشیر بدر کی شاعری ابدی اور آفاقی قدروں کی حامل ہے۔ ان کی شاعری میں اتنی تہہ داری موجود ہے کہ گذرتے وقت کے ساتھ لوگ نہ صرف ان کی شاعری کو اپنے ذہنوں میں محفوظ رکھیں گے بلکہ اسی طرح ان کی شاعری کی مقناطیسی قوت ان کو اپنی طرف کھینچتی رہے گی۔

❑❑❑

ادارہ 'نیا دور' کو موصول ہونے والی کتابیں

رام نائیک
پرکاش پیکیچرس
لکھنؤ

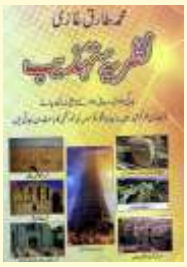

محمد طارق غازی
اقرأ ایجوکیشن فاؤنڈیشن
ممبئی

انیس اشفاق
دانش محل، امین آباد
لکھنؤ

اپیندر ناتھ اشک
مغربی بنگال اردو اکادمی
رفیع احمد قدوائی روڈ، کولکاتا

جمیل احمد صدیقی
امپریشن پرنٹ ہاؤس
لاٹوش روڈ، لکھنؤ

فیاض احمد فیضی
تخلیق کار پبلشرز،
یاور منزل، لکشمی نگر، دہلی

تنویر اختر رومانی
عرشیہ پبلی کیشنز
دہلی

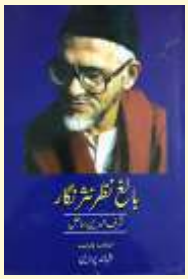

شبانہ پروین
علیم پبلی کیشنز
مومن پورہ، ناگپور

عبدالقیوم فرقت لکھنوی
فخر الدین علی احمد
میموریل کمیٹی، لکھنؤ

شہناز کنول غزی
ایجوکیشنل بک ہاؤس
شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

فراغ روہوی
گلستان پبلی کیشنز
شوکت علی اسٹریٹ، کولکاتا

ہدایت اللہ خاں شمسی
ایم ایس پرنٹرز، چوہان نگر
دہلی

نثار احمد جیراج پوری
٦٧ / جالندھری روڈ
اعظم گڑھ

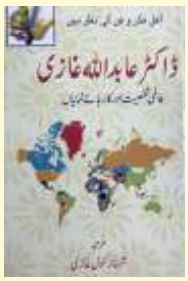

شہناز کنول
اقرأ ایجوکیشن فاؤنڈیشن
ممبئی

سعید رامش
سید رضا القادر

ڈاکٹر شہناز بانو
اتر پردیش اردو اکادمی
لکھنؤ

شموئل احمد
روشان پرنٹرس
دہلی۔٦

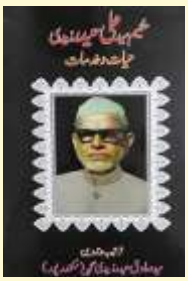

سید صادق زیدی
سید باقر حیدر زیدی
سید تقی حیدر زیدی

وشال کھلر
انشاء پبلی کیشنز
زکریا اسٹریٹ، کلکتہ

ڈاکٹر عابداللہ غازی
اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن
ممبئی

حکیم محمد سالم ادیب
اسکریز، کولکاتا

سفینہ بیگم
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
دہلی

شرف الدین ساحل
علیم پبلی کیشنز
مومن پورہ، ناگپور

ڈاکٹر محمد الیاس
ادبی دائرہ
اعظم گڑھ

نجمہ رحمانی
عرشیہ پبلی کیشنز
دہلی

ڈاکٹر ناظم حسین
روشان پرنٹرس
دہلی

شرف الدین ساحل
علیم پبلی کیشنز
مومن پورہ، ناگپور

صالحہ صدیقی
روشان پرنٹرس
دہلی

ڈاکٹر معظم علی خاں
ایم ایس پرنٹرس

صابرہ محسن
انشاء پبلی کیشنز
کلکتہ

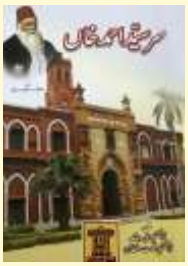

رضیہ حامد، رفعت سلطان
باب العلم پبلی کیشنز
لیک ویو روڈ، بھوپال

ڈاکٹر ارم یونس
اتر پردیش اردو اکادمی
گومتی نگر، لکھنؤ

تفضیل احمد
تاج آفسیٹ پریس
لنگر کوٹی، پٹنہ

حفیظ بن عزیز
ساکشی آفسیٹ
نوبستہ کانپور

شمیم طارق
ایم آر پبلی کیشنز
دریا گنج، نئی دہلی

شمیم اقبال خاں
پرکاش لوک دستار
اندرا نگر، لکھنؤ

ڈاکٹر ذکی طارق
ایم آر پبلی کیشنز
دریا گنج، نئی دہلی

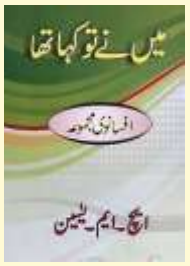

ایچ ایم یٰسین
دانش محل
امین آباد، لکھنؤ

حامد الانصاری غازی
ملت دیوبند
سہارنپور، یوپی

ڈاکٹر فرید پربتی
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس
دہلی

حیات عامر حسینی
زینب پبلی کیشنز
علی گڑھ

ڈاکٹر بانو سرتاج
اقرا ایجوکیشن فاؤنڈیشن
ممبئی

'نیادور' ہندوستان کے بیشتر اہم شہروں کی ایجنسیوں پر دستیاب ہے۔ ایجنسیوں کی فہرست شائع کی جارہی ہے۔

'نیادور' ماڈرن بک ڈپو، جن پتھ، حضرت گنج، لکھنؤ میں بھی دستیاب ہے۔

۱	محمد نعیم دانش محل، سنٹرل ہوٹل، مقابل زیرزمین پارکنگ، امین آباد، لکھنؤ Mo. 9792361533	۳	سید محمد سرور عرش ایسوسی ایٹس، خواجہ ٹاور، نزد وی مارٹ وکٹوریہ اسٹریٹ، نخاس، لکھنؤ	۵	مولانا اسیف جائسی نورِ ہدایت فاؤنڈیشن، امامباڑہ، غفرآنماب چوک، لکھنؤ 8736009814
۲	مولانا محمد وکیل ندوی علامہ شبلی لائبریری، دارالعلوم ندوۃ العلماء ٹیگور مارگ، ڈالی گنج، لکھنؤ۔ 226007	۴	نظامی پریس نزد شیعہ کالج، وکٹوریہ اسٹریٹ نخاس، لکھنؤ	۶	ادارۂ تنظیم المکاتب ریڈ گیٹ بلڈنگ، جگت نارائن روڈ، گولہ گنج، لکھنؤ

ہندوستان کے دیگر شہروں کی ایجنسیاں

۱	جناب اسد یار خان ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکٹ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ 202002 موبائل۔ 96341 05087	۸	جناب ضمیر احمد ضمیر بک ڈپو، قطب شیر، سہارنپور۔ یوپی . 098971 08075	۱۶	میسرس انیس بک ڈپو ۷/۱، محلہ۔ آٹالہ، الہ آباد۔ Mo. 93351 68463
۲	جناب طالب حسین ایف۔ ڈی۔ انٹر کالج، کاٹھ دروازہ، مرادآباد۔ 244001، یوپی۔ موبائل۔ 098372 25809	۹	جناب روشن صدیقی ناصر لائبریری، ابو بازار اونچوا۔ گورکھپور۔ (U.P.) 273001 9451846364	۱۷	جناب عباد احمد ایڈوکیٹ جج صاحب کا پھاٹک، مولوی ٹولہ فانی روڈ، بدایوں۔ 243601 Mo. 94124 08110
۳	ڈاکٹر نہال رضا یوتھ فیڈریشن، عسکری کلینک، محلہ قاضیانہ، پوسٹ ردولی ضلع۔ فیض آباد۔ 224120 موبائل۔ 94151 52710	۱۰	ڈاکٹر شکیل احمد قاسم منزل، ڈومن پورا، چنگی مؤناتھ بھنجن۔ 275101 - Mo. 92367 22570	۱۸	عارف علی بک سیلر لطیف مارکٹ، خیرآباد ضلع سیتاپور۔ 261131(U.P) Mo. 93363 04064
۴	جناب علی حسین ادریسی ادریسیہ بک سینٹر، نیوز پیپر ایجنٹ، سنگت کلا، غازی پور۔ سٹی۔ 233001 یوپی موبائل۔ 93693 05266 .	۱۱	جناب ایس۔ ایم۔ عباس ایڈوکیٹ ۸۸، تار تلہ، جونپور۔ 222001- Mo. 98380 81405	۱۹	جناب ایس۔ عزاز دار حسین نقوی ۲۵/۶۰، حضرت گنج،، دریاباد الہ آباد (U.P) 211003 Mo. 99198 16295
۵	جناب محمد بدرالدین ناولٹی بکس، علامہ اقبال چوک قطعہ گھاٹ، دربھنگہ۔ بہار . 846004	۱۲	جناب بھوانی پرساد گپتا، 'ویدھ' سابق نامہ نگار، 'ترون بھارت' اترولہ، بلرامپور (U.P.) 271604	۲۰	میسرس پوجا پستک بھنڈار سرائے میر، اعظم گڑھ۔ 276305 Mo. 94510 39177
۶	جناب زکریہ ایاز ۱، پریم نگر، اورئی، جالون موبائل۔ 9452452788	۱۳	میسرس کمالیہ بک ڈپو تاتار پور، بھاگلپور۔ بہار، 812002 Mo. 93341 90757	۲۱	میسرس ہمدم بک اسٹال، مبارک پور اعظم گڑھ، 92362 72662
۷	جناب امتیاز انور بک امپوریم، اردو سبزی باغ پٹنہ۔ 800004 موبائل۔ 93048 88739	۱۴	جناب کامل مجید محلہ چاہ میر، مقابل نواب دولہے کی کوٹھی، بدایوں Mo. 94102 93406	۲۲	جناب محمد سلیم (جنرلسٹ) پیر بٹاون (پھلواری)، بارہ بنکی Mo. 94157 74724
		۱۵	جناب ساغر وارثی ایمن زئی، جلال نگر، شاہجہانپور Mo. 93691 90785	۲۳	میسرس نظامی بک ایجنسی (نظامی پریس) محلہ۔ سوتھا، شکیل بدایونی روڈ، بدایوں Mo. 93583 57370

۲۴	میسرس عامر کتاب سینٹر ۳۳۴۔ایچ، گلی نمبر۔۶، باٹلہ ہاؤس جامعہ نگر نئی دہلی۔110025 Mo. 098110 29831
۲۵	میسرس قریشی نیوز ایجنسی جی۔بی۔ایچ۔مین روڈ، راؤ کیلا، اڑیسہ -760001 Mo. 94394 99458
۲۶	میسرس صالحہ بک ٹریڈرس اینڈ اسٹیشنر جامع مسجد، مومن پورا ناگ پور، مہاراشٹر۔-, 440018 Mo. 07122 721069
۲۷	میسرس راعین بک ڈپو ۳۴۷، کٹرہ، الہٰ آباد، (U.P). 211003 Mo. 99365 16895
۲۸	جناب بصر الدین سکریٹری غالب لائبریری، ۶، غالب نگر فیروز آباد، -(U.P).283203 Mo.94562 39242
۲۹	ڈاکٹر وجہہ القمر صدیقی جے۔کے کالونی، لولی پور، حنیف نگر لولی پور سلطانپور (U.P). 228001 Mo.94515 58318
۳۰	جناب تنویر تنویر بک ڈپو، ۱۱۲، جی۔ٹی۔روڈ آسن سول، مغربی بنگال۔ 713301. Mo. 98321 14440
۳۱	میسرس کتاب دار پبلی کیشنز ۱۱۰۔۱۰۸، جلال منزل ٹمکر اسٹریٹ، ممبئی، 7400008
۳۲	خالد لائبریری نزد مسلم فنڈ ٹرسٹ، دیوبند، سہارنپور Mo.92863 64999
۳۳	میسرس ایم۔ایچ بک سیلر ہول سیلر اینڈ ریٹیلر، محلہ رحم گنج دربھنگہ۔.846004 Mo. 094314 58429
۳۴	جناب ندیم اختر جن سیوا کیندر، پوسٹ۔گنج ڈنڈوارہ ضلع۔کاس گنج، (U.P) 207242
۳۵	میسرس خوشتر کتاب گھر پوسٹ، ہلور، سدھارتھ نگر- 272191 Mo. 94156 69624
۳۶	نور نبی بک سیلر اینڈ نیوز پیپر ایجنٹ سی۔کے۔۱۰۱/۴۲، دال منڈی وارانسی۔(U.P) 221001 Mo-94153 55954
۳۷	جناب شہاب حسین 'جرنلسٹ' محلہ ناظر پورہ، بہرائچ۔ 271801 Mo- 94523 11999
۳۸	جناب محمد شوکت علی بک اسٹال ۲۱/اے، ایچ۔ایم۔ایم اسکوائر نزد مسلم انسٹی ٹیوٹ، کولکاتا۔مغربی بنگال
۳۹	جناب خالد قیصر محلہ سریان،، پوسٹ محمدی۔ ضلع لکھیم پور (U.P).262804 Mobile .94155 62853
۴۰	میسرس جبلی بک سینٹر ۱۱۹/۱۰۵، جبلی کالج روڈ چمن گنج، کانپور (U.P).208001 Mo. 09336720718
۴۱	میسرس سحر بک ایجنسی وثیقہ عربک کالج، راٹھ حویلی، ضلع فیض آباد۔ 224001.(U.P), Mo.95653 83714
۴۲	جناب خبیب حسن کمرہ نمبر ۲۲۳، جامعہ سلفیہ، ریوری تالاب بی۔۱/۱۸، جی، وارانسی۔ 221010 Mo . 95576 3570014
۴۳	جناب ایس۔پرویز میسرس ہورائزن ڈسٹر بیوٹر ۱۴۔بی۔گوراچاند روڈ، کولکاتا۔700014 Mo. 9831311918
۴۴	جناب محفوظ الرحمن کنسٹرکشن ڈویژن۔۱، پی۔ڈبلیو۔ڈی، ہردوئی Mo . 9451916715
۴۵	جناب اظہار ندیم عرشیہ پبلیکیشن، اے۔۱۷۰ گراؤنڈ فلور، ۳۔سوریہ اپارٹمنٹ، دلشاد کالونی، نئی دہلی۔ Mo 9971775969
۴۶	میسرس۔سکندر نیوز ڈسٹر بیوٹر اینڈ سپلائر، لال چوک، شری نگر، جے اینڈ کے Mo. 9797797124
۴۷	میسرس کوثر ایجنسی ریاض خان، معرفت اکولہ پان بھنڈار پان مارکٹ، جنتا بازار، اکولہ۔ 444001 Mo. 098221 25888
۴۸	ماسٹر محمد سلیم شجاع ول پور، پوسٹ ڈنڈوارہ۔ضلع کاس گنج Mo. 9557996293
۴۹	جناب سالم رضوی معرفت عثمانیہ بک ڈپو ۱۲۵، ربیندر اسرائے، کولکاتا Mo. 09433050634
۵۰	جناب محبوب علی محلہ۔چکی ٹولہ، پوسٹ لہر پور، سیتا پور Mo. 9559347469
۵۱	جناب حاجی نثار احمد شعبہ اردو، حیدرآباد یونیورسٹی، سینٹرل یونیورسٹی، پروفیسر سی آر راؤ روڈ حیدرآباد۔500046 Mo. 09391062713
۵۲	جناب اشرف الحق انصاری اشرف نیوز ایجنسی، وارث پورا، کامپٹی، ناگپور Mo. 08956697056
۵۵	مکتبۂ جامعہ اردو بازار، جامع مسجد، نئی دہلی۔۶
۵۶	جناب شفیق الرحمن 1/170، گنگا وہار، KDA کالونی، جاج مئو، کانپور موبائل: 9415483499
۵۷	ابرار الحق شاطر گورکھپوری الٰہی باغ نزد چھوٹی مسجد، گورکھپور موبائل: 9695122448

نیا دور کی ایجنسی صرف دس شماروں کی ایڈوانس رقم ڈرافٹ کے ذریعہ بھیج کر حاصل کی جاسکتی ہے۔ایجنسیاں ۴۰ رفیصد کمیشن کی حقدار ہوں گی۔

آپ کے خطوط

ایک مدت بعد ہر دل عزیز رسالہ نیا دور، دسمبر کے شمارے کا دیدار ہوا۔ اس تاریخی رسالے کو ایسی سرسبز صورت میں دیکھ کر دل کی مایوسیاں یکسر دور ہو گئیں۔ دلکش سرورق، منظم فہرست سازی اور معیاری مشمولات اور عمدہ کاغذ سے جیسے نیا دور کو نئی زندگی مل گئی ہو۔ در اصل ایک عرصے بعد گزشتہ دنوں لکھنو کی ایک ادبی تقریب میں شرکت ہوئی اور وہاں کی ایک لائبریری میں بھی جانے کا شرف حاصل ہوا۔ خوش قسمتی سے نیا دور، دسمبر کے شمارے پر نظر پڑی۔ مدیر صاحب کی مدیرانہ صلاحیت اور لیاقت کا اعتراف نہ کرنا بددیانتی کی مثال ہوگی۔ میں نیا دور کے مدیر محترم سہیل وحید صاحب کو اپنی جانب سے دلی مبارکباد پیش کرتی ہوں ساتھ ہی خدا سے دعا کرتی ہوں کہ یہ رسالہ اسی دھوم دھام سے اپنا ادبی سفر طے کرتا رہے۔ یہ رسالہ صحیح معنوں میں قدیم وجدید کا حسین سنگم اور فکری وموضوعاتی سطح پر ایک خوبصورت گلدستہ بن گیا ہے۔ مختلف ادبی اصناف کے ساتھ انصاف کا رویہ اختیار کیا گیا ہے، جو نہایت خوش آئند بات ہے۔ رسالہ دوسری ادبیات کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ خوشی اس بات کی بھی ہے کہ نئے لکھنے والوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ آپ نے اپنے پرمغز اداریے میں لسانیات کے متعلق جو سوالات قائم کیے ہیں، وہ واقعی قابل غور ہیں۔ اردو زبان اور رسم الخط کے حوالے سے شامل شدہ مضامین بے حد کارآمد ہیں۔ خاص طور پر مجھے غضنفر اور انور ادیب کے مضامین پسند آئے۔ یہ دیکھ کر خوش گوار احساس ہوا کہ گل افشانیوں کے تحت طنز ومزاح کو اہمیت دی گئی ہے، جو کہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس سے یقینی طور پر رسالے کی معنویت میں اضافہ ہوگا نیز ایک ستائی ہوئی صنف کو انصاف بھی ملے گا۔ جناب محبوب حسن کا انشائیہ ''اللہ کے نام پر پڑھ لے بابا'' بے انتہا دلچسپ اور فکر انگیز ہے۔ محبوب حسن نے زوال پذیر اخلاقی، تہذیبی اور ادبی روایات کو انتہائی بصیرت افروز اور پرلطف انداز میں پیش کیا ہے، جس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ انہوں نے اپنی اس تحریر میں عصر حاضر کی منفی صورت حال کی جیتی جاگتی اور حقیقی تصویریں پیش کی ہیں، جس سے کسی بھی صورت انکار ممکن نہیں۔ ہم اردو والوں کو اس تحریر سے عبرت لینے کی ضرورت ہے تاکہ ہماری علمی و ادبی وراثت اور تہذیبی قدریں پروان چڑھ سکیں۔ میں ایک بار پھر سے محترم وحید سہیل صاحب کو حوصلہ بخش ادارتی خدمات کے لیے مبارکباد پیش کرتی ہوں۔

شبنم پروین (جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی)

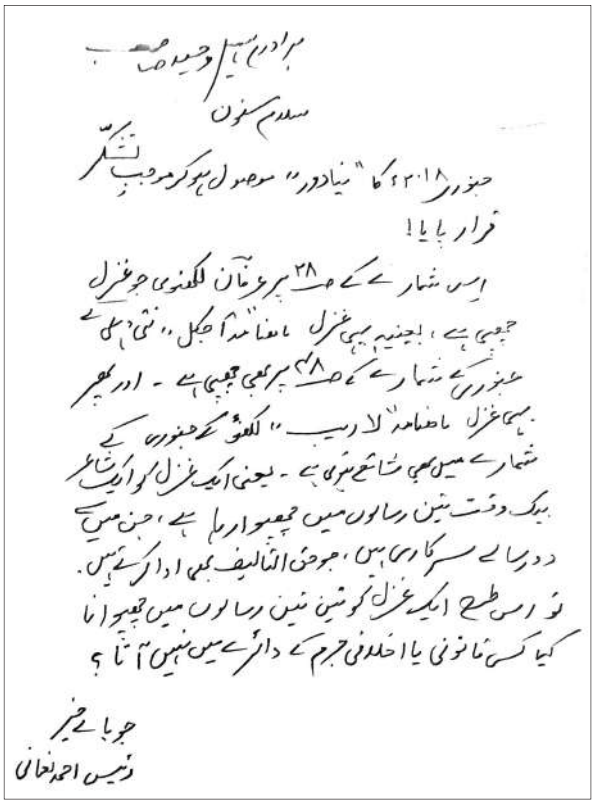

عرصۂ دراز کے بعد یہ شمارے نئے سال کی سوغات کی طرح ملے۔ دل خوش ہو گیا۔ ورق گردانی کی، دیکھا اور ترتیب سے پڑھنا شروع کیا ہے۔ ماشاء اللہ ہر شمارے سرورق سے لے کر اندرونی صفحات تک دلکش ہیں۔ نیا دور میں شائع تمام غزلیں اور مضامین معیاری ہیں اور بہترین طریقہ سے شائع ہوئی ہیں۔ تاثرات کو خط میں تحریر کرنا کوزے میں دریا کی طرح ہے۔ یہ بہت مشکل ہے کہ مضمون اور کس غزل کو کس پر ترجیح دی جائے۔ دسمبر نے شمارے میں شائع نعت نے دل کو بہت متاثر کیا۔ اسی طرح اردو کے مایۂ ناز ادیبوں اور شاعروں کی تاریخ پیدائش کا سلسلہ بھی خوب ہے۔ امید ہے اب سلسلہ وار نیادور حاصل ہوتا رہے گا۔ آپ کی کاوشوں کو سلام

ڈاکٹر شریف الدین خان

رائے پور (چھتیس گڑھ)

برادرم سہیل وحید صاحب

سلام مسنون

جنوری ۲۰۱۸ء کا "نیادور" موصول ہو کر موجب تشکر قرار پایا!

اس شمارے کے ص ۲۸ پر عرفان لکھنوی جو غزل چھپی ہے، بجنسہٖ یہی غزل ماہنامہ آجکل، نئی دہلی کے جنوری کے شمارے کے ص ۴۸ پر بھی چھپی ہے۔ اور یہی غزل ماہنامہ "لاریب" لکھنؤ کے جنوری کے شمارے میں بھی شائع ہوئی ہے۔ یعنی ایک غزل کو ایک شاعر بیک وقت تین رسالوں میں چھپوا رہا ہے، جن میں دو رسالے سرکاری ہیں، جو حق التالیف بھی ادا کرتے ہیں۔ تو اس طرح ایک غزل کو تین تین رسالوں میں چھپوانا کیا کسی قانونی یا اخلاقی جرم کے دائرے میں نہیں آتا؟

جویائے خیر

انیس احمد نعمانی

کل ڈاک سے نیا دور کے کئی شمارے موصول ہوئے۔ شکریہ۔ چند روز پہلے ہی ڈاکٹر نے مجھے لکھنے پڑھنے کی اجازت دی ہے۔ رضوی صاحب غالباً اپنی مصروفیات کے باعث رسالے کی جانب زیادہ توجہ نہیں دے پاتے تھے۔ بہرحال اب آپ نے مطلوبہ توجہ دے کر اسے مزید معیاری بنا دیا ہے۔ 'گوشے' اگر چہ بدنام بہت ہو چکے ہیں لیکن آپ کے گوشے خالص ادبی ہیں، معیاری ہیں اور قصیدوں سے عاری ہیں، تجارتی نہیں ہیں، اس لئے ان کی عظمت بحال ہونے کا امکان ہے۔ عصمت آپا پر تو نمبر شائع کرنا تھا لیکن یہ گوشہ بھی خصوصی نمبر نما ہے۔ نواب جعفر علی خاں اثر مرحوم، یگانہ مرحوم، سراج مرحوم پر بھی گوشے چھاپئے۔ ایک تھے مسعود اختر جمال، ان کو تو سب ہی بھول گئے، واسی آسی کو بھی بھلا دیا گیا ہے وغیرہ وغیرہ

خوش آئند حقیقت ہے کہ مہملیات کو پرموٹ کرنے والے مافیا اپنا Hold ختم ہوتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ ادب کے نام پر کباڑ چھاپنے والے کمزور ہو رہے ہیں، بکواس قسم کے نام نہاد رسائل بھی بند ہوتے جارہے ہیں۔ ملک میں اب رسائل ہی معیاری ہیں۔ آجکل بھی اس فہرست میں شامل ہے اور نیادور بھی۔ سب رس، فکر ونظر، تہذیب الاخلاق اور دس پندرہ رسائل مزید ایسے ہیں جو قابل ذکر ہیں۔

آپ سے میں ذاتی طور پر واقف نہیں مجھے اس کا افسوس ہے۔ سہیل عظیم آبادی مرحوم، عابد سہیل مرحوم اور عابد سہیل کے ماموں ڈاکٹر علیم سے تو ذاتی طور پر واقف تھا اور ہوں۔ عابد سہیل نے بہت جد و جہد کی لیکن کامیابی نہیں ملی، علیم صاحب نے بھی توجہ دی نہ غور کیا۔ میں نے صفی لکھنوی کو تو نہیں دیکھا لیکن یگانہ، سراج، نواب اثر کے علاوہ فراق، جوش، جگر، ندرت میرٹھی، روشن صدیقی، نواب سائل دہلوی، جوش ملسیانی، ماہر القادری، اختر شیرانی، بیخود دہلوی، مخمور دہلوی اور ساغر دہلوی وغیرہ کو دیکھا اور سنا ہے۔

میں نے پہلا مضمون ۱۹۴۸ء میں لکھا اور اب بھی لکھ رہا ہوں لیکن بہت کم۔ ۸۵ سال کا ہو چکا ہوں۔ ڈاکٹر سید محمود صاحب کے مکان پر مولانا عبد الماجد دریا آبادی سے بھی شرف ملاقات حاصل ہوا، صدق، سچ، صدق جدید ہمارے یہاں پابندی سے آتے تھے۔ مولانا دریا آبادی مولانا محمد علی جوہرؔ کے تربیت یافتہ تھے۔ ہاں، خوب یاد آیا، خواجہ حسن نظامی کو دیکھا، ان کے خاص مرید ملا واحدی، ایڈیٹر منادی، میرٹھ اور فردوس، کراچی سے ماہر القادری صاحب سے دفتر فردوس، کراچی میں ملاقات ہوئی تھی۔ بہت مہذب اور انتہائی معقول بزرگ تھے۔ سردار، مجاز، جذبی، سبط حسن، وامق، سلیمان اریب، قدوس صہبائی، شریف عنایت اللہ، احمد ندیم قاسمی، ساحر اور مجروح کے لشکر کا پیادہ بھی رہا۔ سب خواب وخیال ہو گیا۔

سنو، اے شہر خموشاں کے قافلے والو
ہر اک نشان کا انجام بے نشانی ہے
ڈاکٹر آزاد قاسمی
ٹونک (راجستھان)

یقیناً گزشتہ چند ماہ میں ''نیا دور'' کی تبدیلیاں سب کو پسند آئی ہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ آپ کی کوششوں سے ''نیا دور'' سے ہمارے رشتوں کی تجدید ہو گئی۔ رسالہ دیدہ زیب بھی ہوا ہے اور ہر سطح کے قارئین کے پڑھنے کے قابل بھی۔ آپ نے لوگوں کو رسالے سے جوڑنے کی کوشش کی ہے جو قابل ستائش ہے۔ ڈیجیٹل انڈیا کی طرف بڑھتے قدم میں ''نیا دور'' نے بھی اپنی شمولیت کو یقینی بنایا ہے۔ آپ نے فرائڈ کے نظریات سے بحث کرنے والے یا شعور، لاشعور اور تحت الشعور کی بحث کرنے والے مضامین کے بجائے عام قاری کی پسند کو دھیان میں رکھ کر عام دلچسپی کے معلوماتی مضامین شائع کرنے کا فیصلہ کیا جو یقینا قابل تعریف ہے۔ امید ہے کہ قارئین کا ایک بڑا حلقہ ''نیا دور'' کی جانب راغب ہوگا۔ امید ہے آپ بخیر ہونگے۔ ماہنامہ ''نیادور'' کے لئے نیک خواہشات۔

شفیع ایوب
جے این یو، نئی دہلی

جنوری کے شمارے میں آپ نے میری غزل شائع فرمائی، جس کے لئے میں آپ کا انتہائی شکر گزار ہوں مگر افسوس کہ وہ شمارہ مجھے نہیں ملا۔ پتہ نہیں کیوں، ممکن ہے آپ نے بھیجا ہو اور ڈاک کی نذر ہو گیا ہو۔ جنوری کا شمارہ مجھے ایک دوست کے توسط سے ملا۔ بلاشبہ یہ شمارہ بھی صوری ومعنوی اعتبار سے ایک اہم اور معیاری شمارہ کہلانے کا مستحق ہے جس کے لئے آپ اور آپ کے رفقائے کار مبارکباد کے مستحق ہیں۔ میری جانب سے آپ سبھی حضرات کو مبارکباد۔ گوشۂ عابد سہیل بہت ہی اچھا ہے اور قارئین کے لئے معلومات میں اضافہ کا باعث بھی۔ یوم جمہوریہ کے تعلق سے ایم ایم محسن کا مضمون پسند آیا۔ یوم جمہور کی نسبت سے ڈاکٹر ذکی طارق اور دیدار اکبر پوری کی شعری نگارشات حب الوطنی کی عکاس ہیں۔ اپنی بات کے تحت آپ کے اداریہ سے پتہ چلتا ہے کہ نیا دور اب ریختہ، فیس بک اور واٹس اپ پر بھی دستیاب ہے جو کہ نیادور کے قارئین کے لئے ایک اچھی خبر ہے۔ شعری تخلیقات عمدہ اور معیاری ہیں۔ افسانے اس بار سبھی اچھے ہیں ہندی کہانی 'بالجبر' نے متاثر کیا۔ تبصرے بھی نیادور کے معیار کے ہیں۔ جناب بیگ احساس کو دخمہ کی خاطر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کے لئے مبارکباد۔ آئندہ شمارے کی جھلک کے مطابق قارئین کو اگلے شمارے کا انتظار بڑی بے صبری کے ساتھ رہے گا۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اب نیادور قارئین کو پابندی کے ساتھ حاصل ہوگا جس کے لئے آپ کو مبارکباد۔

فردوس گیاوی
گیا (بہار)

نیادور کے شمارے یکے بعد دیگرے مسلسل دستیاب ہو رہے۔ حال ہی میں جنوری کا شمارہ دستیاب ہوا۔ ورق گردانی کے دوران گوشۂ عابد سہیل پر نظر پڑی۔ یادیں تازہ ہو گئیں۔ یقیناً جب کوئی انسان ہمارے درمیان نہیں رہتا، ہم کتنی جلدی اسے فراموش کر دیتے ہیں۔ عابد سہیل سے متعلق کافی معلوماتی گوشہ شائع کیا ہے۔ افسانے بہتر ہیں خاص کر رخشندہ مہدی روحی کا افسانہ عمدہ ہے۔ گیتا شری کی ہندی کہانی بالجبر نے بیحد متاثر کیا۔ ترجمہ بھی روانی سے کیا گیا ہے۔ جنوری کے شمارے میں گزشتہ شمارے کے بہ نسبت غیر ملکی ادب اور طنز ومزاح میں وہ لطف نہیں۔ آئندہ بہتر کی امید ہے۔

نیر مہدی (جلالپور، امبیڈکر نگر)

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی تلک ہال، لکھنؤ میں منعقد

۹/ ریاستوں کے وزراء اقلیتی بہبود کی باہمی میٹنگ کو خطاب کرتے ہوئے (۱۸/جنوری ۲۰۱۸ء)

مرکزی وزیر مالیات جناب ارون جیٹلی اور اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی (۲/فروری ۲۰۱۸ء)

اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی گورکھپور میں

این. ڈی. آر. ایف. اور پی. اے. سی. کے افسران کے ساتھ (۱۳/جنوری ۲۰۱۸ء)

mn ekfld
u;k nkj
ikLV ckDl l0 146]
y[kuÂ & 226 001

'یوم اتر پردیش کے موقع پر' نائب صدر جمہوریہ ہند جناب ایم وینکیا نائیڈو کا استقبال کرتے ہوئے
اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک اور اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ جی (۲۴ر جنوری ۲۰۱۸ء)

اتر پردیش کے گورنر جناب رام نائیک لکھنؤ میں نیتا جی سبھاش چندر بوس کے
یوم ولادت پر منعقد ایک پروگرام میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے (۲۳ر جنوری ۲۰۱۸ء)

نیا دور کے شمارے اب A.H. Wheeler لکھنؤ کے بھی بک اسٹالوں پر بھی دستیاب ہیں

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

o"k ¼ 72 vd 10
Qjojh 2018
eY; ¼ 10 #-@&
okf"kd eY; ¼ 110 #-@&

ith;u l[;k ¼ 4552@51
,y0 MCy@,u0 ih0@101@2006&08
ISSN 0548-0663

idk'kd o end] vut dekj >k] fun'kd }kjk lpuk ,o tulEid foHkkx] m-i- d fy, idk'k idt l] 257 xkykxt] y[kuÂ l
efnr ,o idk'ku iHkkx] lpuk ,o tulEid foHkkx] m-i-] lpuk Hkou] ikd jkM] y[kuÂ&226001 l idkf'kr&lEiknd] lgy oghn